OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ٩٢٣٣ ی ٢ Accession No. ١١٨٧
1187

Author س عزیز مرزا

Title سیرۃ المہدی

This book should be returned on or before the date last marked below.

سیرۃ المحمود

یعنی

سوانح عمری خواجہ جہان عماد الدین محمود گاوان

وزیر سلاطین بہمنیہ

مؤلفہ

عالیجناب مولوی محمد عزیز مرزا صاحب مرحوم و مغفور معتمد عدالت و
کوتوالی و امور عامہ سرکار عالی آنریری سکریٹری آل انڈیا مسلم لیگ

دانیم ترا ز گنجِ مقصود نشان
گر ما نرسیدیم تو شاید برسی

نظامی پریس بدایوں میں طبع ہوئی

محمد حمید الدین ایف آر ایس اے پرنٹر

طبع سوم ۲۰۰۰ ۱۳۴۶ھ م ۱۹۲۷ع قیمت فی جلد عہ

فہرست مضامین

مضمون — صفحہ

تمہید۔ ۱
دکن کی خود مختار سلطنتوں کی تاریخ ۳
محمود گاوان کا خاندان اور ابتدائی حالات ۵
دکن کی بیرونی اور اندرونی حالت ۸
محمود گاوان کا طبقۂ امرا میں داخل ہونا ۱۴
عہد ہمایوں شاہ بہمنی ۱۶
نظام شاہ کی تخت نشینی اور ملکہ مخدومہ جہاں کی ریجنسی ۱۷
رائے اڑیسہ کی چڑھائی ۱۸
محمود شاہ خلجی کی چڑھائی اور اہل دکن کی شکست ۱۹
محمود شاہ گجراتی کی مدد سے محمود شاہ خلجی کا دکن سے نکالنا۔ ۲۳
محمد شاہ کی تخت نشینی اور خواجہ جہان ترک کا قتل ۲۶
محمود گاوان کا عروج ۲۷
محمد شاہ کی شادی ۲۸
مہم کوکن و فتح گوا ۲۸
محمود گاوان کی قدر و منزلت ۳۱
فتح قلعہ گلوار ۳۲
بیجانگر پر ایک نئے خاندان کی حکومت اور محمد شاہ کی چڑھائی ۳۳
سامان شاہی ۳۵
دربار ۳۹
داب شاہی ۴۰

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
منصب امارت	۴۳	آفاقی و دکنی	۵۹
خطابات	۴۴	اسلامی ڈپلومیسی	۶۱
عہدہائے سلطنت	۴۵	خواجہ جہان محمود گاوان کی پرائیویٹ لائف	۶۳
دار السلطنت	۴۶	تزک و احتشام	۶۶
اشاعت علم	۴۷	غرور و انکسار	۶۸
تعمیرات عامہ	۴۸	علم	۶۹
انتظام پولیس و عدالت	۴۸	مناظر الانشا	۷۴
ہنود کی حالت	۴۸	شاعری	۸۲
رحمدل پالیسی	۴۹	ریاض الانشا	۸۸
فوج	۵۰	فن زراعت	۱۰۰
سوسائٹی	۵۲	ہمعصرون کی قدردانی	۱۰۱
اصلاحات انتظامی	۵۴	انکسار	۱۰۲
انتظام فوج	۵۸	خواجہ جہان کی شہادت	۱۰۲

التماس

سیرۃ المحمود کا پہلا ایڈیشن میرے والد ماجد مولوی عزیز مرزا صاحب مرحوم و مغفور نے اپنی زندگی کے ابتدائی زمانہ یعنی سنہ ۱۳۴۱ھ مطابق سنہ ۱۸۹۶ء میں مطبع مقنن دکن حیدرآباد میں چھپوا کر پانسو کی تعداد میں شایع فرمایا تھا۔ اس کے چھپنے کی ہی دیر تھی کہ سب نسخے ہاتھوں ہاتھ نکل گئے اور دوسرے اڈیشن کا تقاضا ہونے لگا لیکن زمانہ نے کچھ ایسا رنگ بدلا کہ مرحوم کی زندگی میں دوسرے ایڈیشن کی نوبت نہیں آئی۔

مولوی عبدالسلام صاحب منشی فاضل ناظم تعلیمات نے جو مرحوم کے معتقد اور ان کی تصانیف کے دلدادہ ہیں اپنے ذاتی اخراجات سے سیرۃ المحمود کا دوسرا ایڈیشن ایک ہزار کی تعداد میں سنہ ۱۳۳۵ھ مطابق سنہ ۱۹۱۶ء میں شایع کیا۔ یہ بھی پہلے کی طرح تھوڑے ہی عرصہ میں ختم ہوگیا اور سیرۃ المحمود کی مانگ میں کمی کی بجائے اور اضافہ ہوگیا۔

جب میں نے ہوش سنبھالا اور سیرۃ المحمود کا تبرکاً بالخصوص اس خیال سے مطالعہ شروع کیا کہ مرحوم نے بالفاظ خود اس کتاب میں اس بات کی کوشش کی ہ

کہ "عماد الدین محمود گاوان وزیر سلاطین بہمنیہ اور اس کے زمانہ کی سچّی تصویر دکھا کر مسلمان نوجوانوں کے لئے عموماً اور اہل دکن کے لئے خصوصاً ایک نمونہ پیش کیا جائے"۔ اور یہ محسوس کیا کہ خود مرحوم کے بعض حالات زندگی محمود گاوان کے حالات سے بہت کچھ ملتے جلتے رہے ہیں اور جس طرح محمود گاوان ملک کی خدمت اور اپنے مالک کی وفاداری میں قربان ہو گئے مرحوم بھی اسی قسم کی سازشوں کا شکار ہوئے تو میں نے اپنے دل میں ٹھان لی کہ سیرۃ المحمود کا ایڈیشن اس کی مسلمہ معنوی خوبیوں کے لحاظ سے تیار کرنے کی عزت حاصل کروں اور مرحوم کے مضامین کے مجموعہ کے ساتھ جو زیر ترتیب ہی ان کی سوانح عمری شایع کروں۔

میری خوش قسمتی ہی کہ سیرۃ المحمود کا نیا ایڈیشن تیار ہو گیا ہی اس میں تصاویر نقشہ جات و فہرست مضامین کا اضافہ کیا گیا ہی اور عمدہ کاغذ اور لکھائی چھپائی کا اہتمام کر کے اس امر کی کوشش کی گئی ہی کہ مرحوم کی دلچسپ و دلپذیر اور سبق آموز تصنیف دیدہ زیب بھی ہو جائے۔

کمترین

سجّاد مرزا

گلبرگہ۔ محرم الحرام ۱۳۴۶ھ ہجری

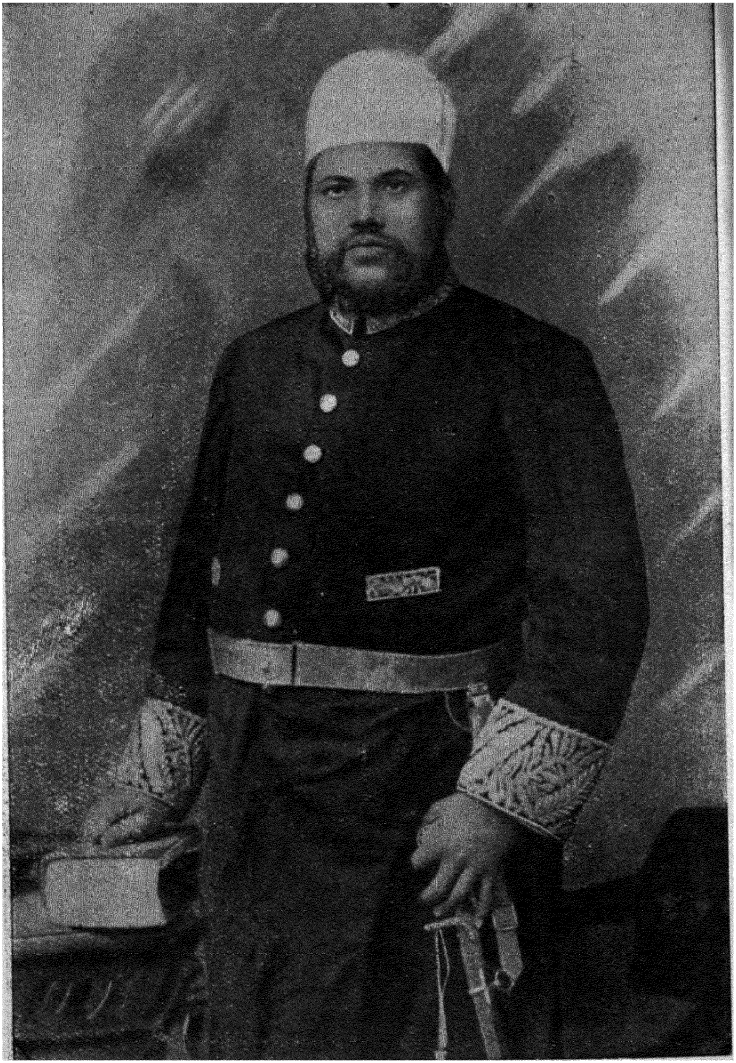

مولوي محمد عزيز مرزا - بی اے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس زمانہ میں یہ خیال تو عام طور پر پیدا ہو گیا ہی کہ قومی عظمت کے لیئے شخصی ترقی کی ضرورت ہی۔ لیکن بدقسمتی سے مسلمانوں کے سامنے اپنے اسلاف کے ایسے نمونے بہت کم موجود ہیں جو اُن کو راہ سے بے راہ نہ ہونے دیں اور اپنی پیروی کی ترغیب دیکر حقیقت میں اُن کو قومی ترقی کا باعث بنائیں اگرچہ یہ صحیح طور پر کہا جا سکتا ہی کہ اعلیٰ درجہ کے اخلاق کے نمونے جیسے تاریخ اسلام میں موجود ہیں۔ اُن کی نظیر بہت ہی کم کسی دوسری قوم کی تاریخ میں مل سکتی ہی لیکن افسوس ہی کہ ان بیش بہا میراث تک پہنچنے میں ایسی دشوار گزار گھاٹیاں طی کرنی پڑتی ہیں کہ ہر شخص کو رسائی نہیں ہو سکتی۔ اور اس لیئے اس زمانہ میں یہ بہت بڑا قومی فرض ہی کہ مشاہیر اسلام کے واقعات زندگی کو ایسے پیرایہ میں لکھا جائے جو عام دلچسپی کا باعث ہو۔ اس مختصر رسالہ میں اس بات کی کوشش کی گئی ہی کہ **عماد الدین محمود گاوان** وزیر سلاطین بہمنیہ اور اُس کے زمانہ کی سچی تصویر دکھا کر مسلمان نوجوانوں کے لیئے عموماً اور

اہل دکن کے لیئے خصوصاً ایک نمونہ پیش کیا جائے **کرنل میڈوز ٹیلر** نے اپنی تاریخ ہند میں اعتراف کیا ہی کہ **محمود گاوان** جیسے اشخاص دنیا میں بہت ہی کم گزرے ہیں۔ اگر اس کتاب کے مطالعہ سے کسی ایک شخص کو بھی اس بات کی ترغیب ہوئی کہ محمود گاوان کی اخلاقی برتری کو اپنی زندگی کا معیار بنائے تو مولف کی تمام محنت وصول ہو جائے گی۔

مجھ کو آخر میں اعتراف کرنا چاہیئے کہ مولوی عبدالجبار خاں صاحب صدر مدرس مدرسۂ اعز کی تاریخی ذخیرہ سے بہت مدد ملی ہی۔ فقط

خاکسار

محمد عزیز مرزا

حیدرآباد دکن۔ غرہ محرم سنہ ۱۳۱۴ ہجری

۷۸۶

جز نام نیک چوں بجہاں یادگار نیست
حیف است بر کسی کہ نہ او نیک نام زیست

علاؤ الدین خلجی کے فاتح قدم نہیں معلوم کس مبارک گھڑی میں دکن کی طرف اُٹھے تھے کہ گو اسلامی حکومت کے آثار ہندوستان کے بڑے حصے سے معدوم ہوتے جاتے ہیں لیکن ابھی تک یہاں ایک کروڑ سے زیادہ مخلوق بادشاہِ اسلام کے حفظ وحمایت اور اسلامی جھنڈے کے سایہ میں عیش وعشرت سے زندگی بسر کر رہی ہی اس چھوٹے سے خطے کی تاریخ بہت دلچسپ ہی اور اگر اُس پر سرسری نظر بھی ڈالی جائے تو عجیب سماں نظر آتا ہی۔ ابتدا سے وسط ہند کے دُشوار گزار پہاڑوں اور موّاج دریاؤں نے اس ملک میں خود مختار حکومتوں کے قایم ہونے کی صلاحیت پیدا کر دی تھی جب شمالی ہندوستان پر سرداران آریہ کی چڑھائی اور تصرف ہو تو ایک عرصہ دراز تک دکن اُن کی دست برد سے محفوظ رہا۔ مگر جب اُن کی حکومت وہاں خوب جم گئی تو اس طرف توجہ کی گئی لیکن اُس توجہ کا بھی صرف یہ نتیجہ

ہوا کہ راجپوت راجاؤں کی چند خود مختار حکومتیں جو شمالی ہندوستان کے کسی راجہ کی دست نگر نہ تھیں قایم ہوگئیں[1]۔ اسی طرح مسلمانوں نے اپنی مستقل حکومت شمالی ہندوستان میں قایم کرنے کے ایک صدی بعد تک دکن کا رُخ نہیں کیا لیکن جب علاءُ الدین خلجی کی نے قرار پُر حوصلگی نے شمالی و شرقی و غربی ہندوستان کی حکومت کو تنگ سمجھ کر اس ملک پر زبردست حملے کیئے تو دکن سلطنتِ دہلی کا ایک صوبہ ہوگیا۔ مگر بعد مسافت اور راستے کی دشوار گزاریوں نے پچاس ساٹھ برس ہی میں اس شہنشاہی تعلق کا خاتمہ کر دیا اور سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی[2] نے ایک زبردست خود مختار

---

[1] فلیٹ راجایان کنہڑی۔

[2] علاء الدین حسن گنگو بہمنی کا اصلی نام حسن اور قوم کا افغان تھا۔ ابتدا میں وہ ایک برہمن گنگو نامی کا ملازم یا غلام تھا جو اُس کی بہت قدر کرتا تھا اور جس نے اُس کی آئندہ عظمت کی نسبت پیش گوئی کی تھی۔ سلطان محمد تغلق کے زمانہ میں وہ سپاہی کے درجہ سے سرلشکری کے مرتبہ پر پہونچا اور آخر کار محمد تغلق کے مجنونانہ ظلم و ستم کی وجہ سے اُس نے سنہ ۱۳۴۷ء میں بغاوت کر کے ایک جدید خود مختار سلطنت کی بنیاد ڈالی اور اپنے قدیم سرپرست برہمن کی شکر گزاری کے خیال سے الفاظ "گنگو بہمنی" کو اپنے نام کا جزو بنایا۔ مناسب ہوگا کہ اس مقام پر بغرض آسانی خاندان بہمنیہ کے کل بادشاہوں کے نام مع سنہ جلوس و وفات لکھ دیئے جائیں۔

نام بادشاہ	سنہ جلوس	سنہ وفات
علاؤ الدین حسن گنگو بہمنی	سنہ ۱۳۴۷ء	سنہ ۱۳۵۸ء
محمد شاہ اول	سنہ ۱۳۵۸ء	سنہ ۱۳۷۵ء
مجاہد شاہ	سنہ ۱۳۷۵ء	سنہ ۱۳۷۸ء

سلطنت قایم کی جو ایک سو پچاس برس تک قایم رہنے کے بعد پانچ آزاد حکومتوں میں تقسیم ہوئی اور جب پھر سلاطین مغلیہ کی حوصلہ مندی نے پیہم حملوں کے بعد ان خود مختار سلطنتوں کو خاک میں ملایا تو اُس کا صرف یہ نتیجہ ہوا کہ پچاس ساٹھ برس

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲

نام بادشاہ	سنہ جلوس	سنہ وفات
داود شاہ	۱۳۷۸ء	۱۳۷۸ء
محمود شاہ اول	۱۳۷۸ء	۱۳۹۷ء
غیاث الدین	۱۳۹۷ء	۱۳۹۷ء
شمس الدین	۱۳۹۷ء	۱۳۹۷ء
فیروز شاہ	۱۳۹۷ء	۱۴۲۲ء
احمد شاہ اول	۱۴۲۲ء	۱۴۳۵ء
علاءالدین ثانی	۱۴۳۵ء	۱۴۵۷ء
ہمایوں شاہ ظالم	۱۴۵۷ء	۱۴۶۱ء
نظام شاہ	۱۴۶۱ء	۱۴۶۳ء
محمد شاہ ثانی	۱۴۶۳ء	۱۵۸۲ء
محمود شاہ ثانی	برائے نام ۱۴۸۲ء	۱۵۱۸ء
احمد شاہ ثانی	۱۵۱۸ء	۱۵۲۰ء
علاءالدین ثالث	۱۵۲۰ء	۱۵۲۲ء
ولی اللہ	۱۵۲۲ء	۱۵۲۶ء
کلیم اللہ	۱۵۲۶ء	

[۱] پانچ سلطنتیں جن میں سلطنت بہمنیہ تقسیم ہوئی حسب ذیل تھیں۔
(۱) عادل شاہ بیجاپور (۲) نظام شاہیہ احمد نگر۔ (۳) قطب شاہیہ گولکنڈہ (۴) عماد شاہیہ برار (۵) برید شاہیہ بیدر۔

تک شاہان دہلی سے ایک ضعیف تعلق باقی رہا اور اُس کے بعد پھر وہی قدیمی حالت قایم ہو گئی۔

دکن کی خود مختار سلطنتوں کی تاریخ

دکن کی اِن خود مختار حکومتوں کی تاریخ غور سے دیکھی جائے تو بادشاہانِ اولوالعزم کو چھوڑ کر صرف ایک ایسا شخص[1] نظر آتا ہی کہ گو وہ سلطانِ وقت نہ تھا لیکن ایک زمانہ پر اُس نے ایسے پایدار نقشِ پا چھوڑے ہیں کہ آج تک نمودار اور بھولے بھٹکوں کو راہ بتا رہے ہیں۔ اس شخص کی ذات بہت سی عمدہ صفات سے متّصف تھی۔ مجلس شوریٰ میں بیدار مغز مشیر۔ میدان جنگ میں خوش تدبیر جنرل۔ علما میں عالم باعمل۔ فقرا میں صوفی صاف نہاد۔ اور دُنیا داروں میں ایک کامیاب دُنیا دار تھا۔ یہ شخص نہ صرف دکن کی تاریخ میں فرد ہی بلکہ تاریخ اسلام میں بھی بہت کم ایسے شخص ملتے ہیں جن کی ذات اتنی اعلیٰ صفات کا مجموعہ ہو۔ ایسے شخصوں کے کارنامے اور حالات زندگی آئندہ نسلوں کے لیے ایک بیش بہا میراث ہوتے اور پُرجوش نوجوانوں کی رگوں میں

---

[1] چونکہ یہ مضمون مختصر ہی اس لیے جا بجا اسناد کے حوالے کی ضرورت نہیں معلوم ہوئی صرف اس مقام پر لکھ دیا جاتا ہی کہ یہ مضمون تاریخ فرشتہ اور مآثر برہانی۔ اور کرنل میڈوز ٹیلر کی کتاب آرکی ٹیکچر آف بیجاپور اور گرانٹ ڈف کی تاریخ مرہٹہ پر زیادہ تر مبنی ہی اور جہاں کہیں اور کسی کتاب سے مدد لی گئی ہی اُس کا نام لکھ دیا گیا ہی۔

تازہ خون دوڑانے کے لیے تازیانۂ ہدایت کا کام کرتے ہیں۔ گو اُس کے ہمعصروں نے اُس کا نام اور اُس کی خوبیوں کی یاد قایم رکھنے کی کوشش سے غفلت نہیں کی اور اُس کی زندہ مگر خاموش یادگاریں ابھی تک صفحۂ ہستی پر موجود ہیں لیکن اس زمانے میں جبکہ مسلمانوں کو اپنے اسلاف کی خوشگوار داستانوں میں لطف آنے لگا ہی افسوس ہی کہ کسی شخص نے خواجہ عماد الدین محمود گاوان کی سوانح عمری کی طرف توجہ نہیں کی۔

عماد الدین محمود گاوان کا وزارت دکن بلکہ ہند میں وہی مرتبہ ہی جو وسط ایشیا کے وزیروں میں خواجہ نظام الملک کا ہو۔

محمود گاوان کا خاندان اور ابتدائی حالات

خواجہ عماد الدین محمود گاوان کے اجداد شاہان گیلان کے وزرا میں داخل تھے اور اُن میں سے ایک شخص نے اپنی ذاتی کوششوں اور قابلیت کی بدولت رشت کی بادشاہی حاصل کی تھی اور یہ خودمختار حکومت اُس کے خاندان میں شاہ طہماسپ صفوی والی ایران کے زمانہ تک جس نے اُس کا خاتمہ کیا قایم رہی۔ محمود گاوان قریہ قاوان میں جو علاقہ گیلان میں ہی سنہ ۱۴۰۵ء مطابق سنہ ۸۰۸ھ میں پیدا ہوا اور اسی وجہ سے عرف عام گاوان کے لقب سے مشہور ہوا۔ اُس کے باپ کا نام خواجہ محمد تھا اور اُس کا چچا خواجہ شمس الدین

امیر محمد والی گیلان کا وزیر تھا۔ ابتدائی عمر میں محمود گاوان نے اپنے رشتہ داروں کی شفقت آمیز نگرانی میں وطن ہی میں تعلیم پائی اور اس میں شک نہیں کہ اُس زمانہ کے لحاظ سے اُس کی تعلیم اعلیٰ درجہ کی ہوئی تھی اور جب سنِ شعور کو پہونچا تو کاروبارِ ریاست میں اپنے چچا کو مدد دینے لگا اور رفتہ رفتہ امورِ سلطنت میں بہت دخیل ہو گیا چند سال کے بعد محمود گاوان مکہ معظمہ چلا گیا اور اُس کے دو برس بعد اُس کا چچا خواجہ شمس الدین بھی ہجرت کر کے حجاز کو روانہ ہو گیا اور اپنے بیٹے خواجہ محمد کو اپنا جانشین کر گیا مگر خواجہ محمد کی ناتجربہ کاری کی وجہ سے وہی فتنے اور فساد کھڑے ہو گئے جو ایشیائی سلطنتوں میں ہمیشہ حکومت کی کمزوری کی وجہ سے کھڑے ہو جایا کرتے ہیں یعنی ایک شخص حاجی محمد قندھاری جو محمود گاوان کا دست گرفتہ تھا سپہ سالاری کے درجہ پر پہونچا اور ایک دوسرا شخص شیخ علی نامی جو اُس کے خاندان کا تربیت یافتہ تھا وزیر ہو گیا۔ اور دونوں شخص امیر محمد پر اس قدر حاوی ہو گئے کہ اُن کے مقابلہ میں کسی کی نہ چلتی تھی۔ اُنھوں نے بادشاہ کے مزاج میں دخیل ہو کر سب سے پہلے اپنے محسنوں کے خاندان کی تباہی کو اپنے استقلال کا ذریعہ سمجھا یہ حالت دیکھ کر خواجہ محمد بھاگ کر اپنے باپ کے پاس مکہ معظمہ چلا گیا اور خواجہ محمود گاوان بھی وطن میں جائے امن نہ پاکر ترکِ وطن پر مجبور ہوا۔ اور

گو بادشاہانِ عراق و خراسان نے وزارت کی ترغیب دی لیکن اُس کی عالی ہمتی نے قبول نہ کرکے تجارت کو کسب معاش اور ربع مسکوں کی سیر کا ذریعہ بنایا میلان طبعی کی وجہ سے جس کو شوق جستجوئے کمال نے اور بھی پختہ کر دیا تھا دوران سفر میں جہاں کہیں اُس کا گزر ہوتا تھا علما و مشایخین کی صحبت سے فائدہ اور اُن کی ہمکلامی سے لطف اُٹھاتا اور کاروبار تجارت کی ترقی دینے میں کوشش کرتا تھا اسی طرح اُس نے بہت سے ملکوں کی سیر اور وہاں کے مختلف رسوم و رواج سے واقفیت حاصل کی اور چونکہ بچپن ہی سے ہند کے اموال نفیسہ صنایع غریبہ۔ امراء دولتمند مشائخ کبار اور سلاطین اولوالعزم کی تعریف سُنتا تھا اس لیے جب اُس کا سن چالیس برس سے متجاوز ہوا تو خلیج فارس سے ہندوستان کا ارادہ کیا۔ اور ۱۴۵۵ء میں بندر دابھول میں داخل ہوا۔ سب سے پہلے اُس کے قدم محمد آباد بیدر کی طرف بڑھے جو اُس زمانہ میں شاہان بہمنیہ کا دار السلطنت اور شاہ محب اللہ کرمانی کا مسکن تھا۔ شاہ محب اللہ کرمان کے مشہور ولی شاہ نعمت اللہ کے پوتے تھے جو اپنے زمانہ میں وسط ایشیا سے لیکر ہندوستان تک کی خوش اعتقادی کا مرکز تھے۔ احمد شاہ ولی بہمنی کو اُن سے خاص اعتقاد تھا

لہ دابھول کوکن میں ایک بندر ہے جو اب ضلع رتناگری میں ہے۔

اور اس لیئے گو شاہ نعمت اللہ نے ترکِ وطن قبول نہ کیا مگر اُن کی اولاد نے بادشاہ کی خوش اعتقادی کو اعلیٰ مراتب کا زینہ سمجھ کر ہند کو اپنا بنا لیا چنانچہ شاہ محب اللہ اور اُن کے بھائی حبیب اللہ کو بادشاہ کی دامادی کی عزت حاصل ہوئی۔

دکن کی بیرونی اور اندرونی حالت

جس وقت خواجہ عماد الدین محمود گاوان نے بندر دابھول میں قدم رکھا ہے اُس وقت ہندوستان کی ایک خاص حالت تھی دہلی میں لودیوں کی حکومت قایم ہو چکی تھی اور گو کہ وہ کل ہندوستان کی سلطنت کے مدعی تھے لیکن اُن کی اطاعت صرف اضلاع شمالی و مغرب و پنجاب پر محدود تھی۔ جون پور میں سلاطین شرقی آزادی کا ڈنکا بجا رہے تھے مغرب میں راجپوتانہ کے راجہ خود مختاری میں مست تھے۔ گجرات میں آل مظفر کی حکمرانی تھی وسط ہند میں خاندان فاروقیہ کا خاندیس میں اور خانوادۂ خلجیہ کا مالوہ میں زور تھا اور دکن میں سلاطین بہمنیہ کا تسلط تھا یہ تو اسلامی سلطنتیں تھیں۔ ان کے علاوہ ہندوؤں کی ایک قومی سلطنت بیجانگر میں قایم تھی جس کی حکومت تمام ساحل ملابار و کوکن پر دریائے کرشنا کے جنوبی کنارہ تک پھیلی ہوئی تھی اور ساحل کارومنڈل کی طرف رایان اوڑیسہ حکمران اور بولوالعزمی سے حکومت

دکن کے دعویدار تھے غرضکہ ہندوستان کے اُس وقت متعدد ٹکڑے اور ہر ٹکڑے میں ایک خودمختار سلطنت تھی جو دوسری سلطنتوں کو اپنا رقیب اور ترقی کا مزاحم سمجھ کر اُن کے استیصال کی فکر میں رہتی تھی۔ سلاطین بہمنیہ کی حالت سب سے خطرناک تھی۔ جنوب میں بیجانگر کے راجہ دم نہ لینے دیتے تھے مشرق میں رایانِ اوڑیسہ کی چڑھائی رہتی تھی شمال میں سلاطین مالوہ وخاندیس رقابت سے دیکھتے تھے اور مغرب میں سلاطین گجرات دھمکی دے رہے تھے۔ ملک کی اندرونی حالت یہ تھی کہ دو قومی گروہوں کی رقابت نے حکومت کو کمزور کر رکھا تھا۔ دکن میں ملکی وغیر ملکی کا جھگڑا کچھ نیا نہیں ہے۔ یہاں کے اصلی باشندے قوم میں ڈریوڈین اور مذہب میں ہندو تھے لیکن جب مسلمانوں کا تسلط ہوا تو اسلامی نوآبادیاں قایم ہوئیں اور چونکہ ہندوؤں سے ہی مقابلہ رہتا تھا اس لیئے عام اسلامی اصول اور تدبیر ملکی کے بموجب اس بات کی ضرورت ہوئی کہ فوج مسلمان ہو اس لیے ابتدائی قیام حکومت سے ایران وعرب وحبش وشمالی ہندوستان سے سپاہی پیشہ لوگوں کے گروہ کے گروہ تلاش معاش میں چلے آتے تھے۔ یہ لوگ بعد مسافت اور دشواری راہ کی وجہ سے ترک وطن پر مجبور ہو کر دکن ہی میں سکونت اختیار کر لیتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ اُن کی اولاد تمام ملک

مع کل امرا و ارکان دولت شہر کے چار کوس باہر بھیجا اور خلعت خاص مع کمر و شمشیر مرصع و چند زنجیر فیل و عنبرچہ عطا کیا اور اُس کے ایک رفیق شاہ قلی سلطان کو جس نے گزشتہ مہم میں داد شجاعت دی تھی اپنی دامادی کی عزت بخشی اور حکم دیا کہ آئندہ سے غریب الدیار مجلس و سواری میں بادشاہ کے دست راست اور دکنی و حبشی دست چپ رہا کریں۔ یہ حکم ایسی منحوس گھڑی میں دیا گیا تھا کہ اُسی دن سے دکنی و آفاقی میں کھلم کھلا مخالفت شروع ہوئی جس کا چند ہی روز میں یہ نتیجہ ہوا کہ ان دونوں گروہوں کی آپس کی رقابت کی وجہ سے حکومت کمزور اور ملک میں عجیب طرح کی بے امنی قایم ہوگئی۔ ہر فریق دوسرے فریق کی تباہی کی فکر میں رہنے لگا اور بادشاہ کے تلون کی وجہ سے کبھی کوئی فریق غالب آ جاتا تھا اور کبھی کسی کا ستارۂ اقبال بلندی پر پہنچ جاتا تھا۔ سلطان علاء الدین بہمنی[1] گو ایک نیک نفس

---

[1] سلطان علاء الدین بہمنی جس کے زمانہ میں محمود گاوان دکن میں آیا ۱۴۳۶ء میں تخت نشین اور ۱۴۵۸ء میں فوت ہوا۔ علاء الدین علم کا بڑا قدر شناس اور امور ریاست سے خوب واقف تھا اُس نے ہر ضلع میں عدالتیں اور شہروں اور دیہات میں مسجدیں قایم کیا۔ قماربازی اور شراب خواری کی قطعاً ممانعت کر دی اور محتسب مقرر کیے۔ گداگری کا اس طرح سے استیصال کیا کہ تمام فقیروں کو پکڑوا کر شہر کی موریوں کے صاف کرنے اور سڑکوں پر جھاڑو دینے پر مقرر کیا جس کا نتیجہ ہوا کہ یا تو وہ شہر بدر ہوگئے یا راہ راست پر آگئے۔ بادشاہ متحمل اور پکا متعصب مسلمان تھا یہاں تک کہ کسی نصرانی یا ہندو سے بات نہ کرتا اور ان دونوں فرقوں کو قابل ملازمت خیال نہ کرتا تھا۔

(تاریخ فرشتہ و ماثر برہانی)

بادشاہ تھا اور ابتدائے عہد میں اُس نے والی بیجانگر پر یورش کرکے اپنی اولوالعزمی کا ثبوت بھی دیا تھا لیکن جب اس مہم سے فارغ ہوا تو اپنے طبعی میلان کے بموجب عیش و عشرت میں محو ہوگیا اور کاروبار سلطنت کو عہدہ داروں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ دکنیوں اور آفاقیوں کی مخالفت کو بہت زور ہوا اور قسم قسم کی سازشیں کھڑی ہوگئیں۔ آفاقیوں کا سرگروہ ملک التجار خلف حسن بصری طرفدار بیجاپور اور دکنیوں اور حبشیوں کے سرگروہ مشیر الملک دکنی اور نظام الملک غوری تھے۔ جب تقدیر کی گردش سے ملک التجار خلف حسن بصری رائے سنگیر کے مقابلے میں قتل ہوا تو دکنیوں کو موقع ملا اُنھوں نے بادشاہ کو بہکا کر آفاقیوں کے استیصال کی فکر کی اور پانچ چھ ہزار اشخاص کو جن میں کئی ہزار خورد سال بچے بھی تھے بغاوت کے الزام میں قتل اور اُن کی عورتوں کی طرح طرح پر بےعزتی کی۔ اگرچہ دکنیوں نے ایسا بندوبست کیا تھا کہ آفاقیوں کی کوئی عرضداشت بادشاہ تک نہ پہنچنے پائے لیکن چند امرائے غریب الدیار جو باقی رہ گئے تھے تین سو ہمراہیوں کے ساتھ بہزار خرابی و مصیبت کسی نہ کسی طرح بادشاہ تک پہونچنے میں کامیاب ہوئے پھر تو بادشاہ کی آنکھیں کھلیں اور جو غضب کہ اس وقت تک آفاقیوں پر نازل تھا وہ دکنیوں کے سر پر منتقل ہوا اور دکنی سرداروں کو قتل

مع کل امراء و ارکان دولت شہر کے چار کوس باہر بھیجا اور خلعت خاص مع کمر و شمشیر مرصع و چند زنجیر فیل و عنبر چہ عطا کیا اور اُس کے ایک رفیق شاہ قلی سلطان کو جس نے گزشتہ مہم میں داد شجاعت دی تھی اپنی دامادی کی عزت بخشی اور حکم دیا کہ آئندہ سے غریب الدیار مجلس و سواری میں بادشاہ کے دست راست اور دکنی و حبشی دست چپ رہا کریں۔ یہ حکم ایسی منحوس گھڑی میں دیا گیا تھا کہ اُسی دن سے دکنی و آفاقی میں کھلم کھلا مخالفت شروع ہوئی جس کا چند ہی روز میں یہ نتیجہ ہوا کہ ان دونوں گروہوں کی آپس کی رقابت کی وجہ سے حکومت کمزور اور ملک میں عجیب طرح کی بے امنی قائم ہو گئی۔ ہر فریق دوسرے فریق کی تباہی کی فکر میں رہنے لگا اور بادشاہ کے تلون کی وجہ سے کبھی کوئی فریق غالب آ جاتا تھا اور کبھی کسی کا ستارۂ اقبال بلندی پر پہنچ جاتا تھا سلطان علاء الدین بہمنی گو ایک نیک نفس

---

[1] سلطان علاء الدین بہمنی جس کے زمانہ میں محمود گاواں دکن میں آیا ۱۴۳۶ء میں تخت نشین اور ۱۴۵۸ء میں فوت ہوا۔ علاء الدین علم کا بڑا قدرشناس اور امور ریاست سے خوب واقف تھا اُس نے ہر ضلع میں عدالتیں اور شہروں و دیہات میں پولیس قائم کیا۔ قماربازی اور شراب خواری کی قطعاً ممانعت کر دی اور محتسب مقرر کیے۔ گداگری کا اس طرح سے استیصال کیا کہ تمام فقیروں کو پکڑوا کر شہر کی موریوں کے صاف کرنے اور سڑکوں پر جھاڑو دینے پر مقرر کیا جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ یا تو وہ شہر بدر ہو گئے یا راہ راست پر آ گئے بادشاہ متحمل اور پکا متعصب مسلمان تھا یہاں تک کہ کسی نصرانی یا ہندو سے بات نہ کرتا اور ان دونوں فرقوں کو قابل ملازمت خیال نہ کرتا تھا۔

(تاریخ فرشتہ و ماثر برہانی)

بادشاہ تھا اور ابتداء عہد میں اُس نے والی بیجانگر پر یورش کرکے اپنی اولوالعزمی کا ثبوت بھی دیا تھا لیکن جب اس مہم سے فارغ ہوا تو اپنے طبعی میلان کے بموجب عیش و عشرت میں محو ہوگیا اور کاروبار سلطنت کو عہدہ داروں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ دکنیوں اور آفاقیوں کی مخالفت کو بہت زور ہوا اور قسم قسم کی سازشیں کھڑی ہوگئیں۔ آفاقیوں کا سرگروہ ملک التجار خلف حسن بصری طرفدار بیجاپور اور دکنیوں اور حبشیوں کے سرگروہ مشیر الملک دکنی اور نظام الملک غوری تھے۔ جب تقدیر کی گردش سے ملک التجار خلف حسن بصری رائے سنگیر کے مقابلے میں قتل ہوا تو دکنیوں کو موقع ملا اُنھوں نے بادشاہ کو بہکاکر آفاقیوں کے استیصال کی فکر کی اور پانچ چھ ہزار اشخاص کو جن میں کئی ہزار خورد سال بچے بھی تھے بغاوت کے الزام میں قتل اور اُن کی عورتوں کی طرح طرح پر بےعزتی کی۔ اگرچہ دکنیوں نے ایسا بندوبست کیا تھا کہ آفاقیوں کی کوئی عرضداشت بادشاہ تک نہ پہنچنے پائے لیکن چند امرا غریب الدیار جو باقی رہ گئے تھے تین سو ہمراہیوں کے ساتھ بہزار خرابی و مصیبت کسی نہ کسی طرح بادشاہ تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے پھر تو بادشاہ کی آنکھیں کھلیں اور جو غضب کہ اس وقت تک آفاقیوں پر نازل تھا وہ دکنیوں کے سر پر منتقل ہوا اور دکنی سرداروں کو قتل

اور عام طور پر اس گروہ کے لوگوں کو اعلیٰ خدمتوں سے معزول کیا گیا اور آفاقیوں کی قدردانی و عزت افزائی ہوئی جس کی وجہ سے ان دونوں گروہوں کی آپس کی مخالفت میں اور بھی ترقی ہوئی۔ مختصر یہ ہی کہ خواجہ عماد الدین محمود گاوان ایک نہایت پُرآشوب زمانہ میں دکن میں داخل ہوا سلطان علاء الدین علم دوست، اور علما و فضلاؤ شعرا کا قدردان تھا اس لیئے اُس کو محمود گاوان جیسے جہاں دیدہ عالم و فاضل و تجربہ کار شخص کی صحبت میں بہت لطف آیا اور چند ہی روز میں اُس سے اس قدر مانوس ہو گیا کہ بہت عزیز رکھنے لگا۔ محمود گاوان وطن سے نے وطن تو پہلے ہی ہو چکا تھا اُس نے جب اپنے بہت سے ہموطنوں کو بیدر میں اعلیٰ مناصب پر دیکھا اور بادشاہ کو مہربان پایا تو چند ہی روز میں دکن کو اپنا وطن سمجھنے لگا۔

محمود گاوان کا طبقۂ امرا میں داخل ہونا معلوم ہوتا ہی کہ محمود گاوان اپنی دانشمندی اور کاردانی سے چند ہی روز میں بادشاہ کا اس قدر معتمد علیہ بن گیا کہ جب سنہ ۱۴۵۶ء میں اُس کے بہنوئی جلال خاں نے علم مخالفت بلند اور صوبہ تلنگانہ پر قبضہ کر کے محمود شاہ خلجی والی مالوہ کو والیِ خاندیس کی مدد سے دکن پر چڑھائی کرنے پر اس ترغیب سے آمادہ کیا کہ بادشاہ دکن کا انتقال ہو چکا ہی امرا ر خود غرضی سے

اس خبر کو چھپائے ہوئے ہیں ایسے وقت میں ملک بہت آسانی سے ہاتھ آجائیگا تو سلطان علاء الدین نے خواجہ محمود گاوان کو منصب ہزاری دیکر بعض امرا کے ساتھ جلال خاں کے مقابلہ کے لیئے روانہ کیا اور قاسم بیگ صف شکن کو والی خاندیس کے مقابلہ مین بھیجکر خود محمود شاہ خلجی کی طرف بڑھا۔ محمود خلجی تو اس امید سے آیا تھا کہ شاہ دکن فوت ہوچکا ہی جب اُس نے دیکھا کہ وہ زندہ ہی اور اُس کے مقابلے کے لیئے مستعدی سے بڑھا چلا آتا ہی تو راتوں رات اپنے ملک کو چلا گیا خواجہ محمود گاوان فن سپہگری سے واقف نہ تھا مگر اُس زمانہ کا طرز تعلیم کچھ ایسا تھا کہ ایک تعلیم یافتہ شخص ضرورت کے وقت ہر کام کو ایسی عمدگی سے انجام دیتا تھا کہ گویا اُس کی تمام عمر اُسی کے سیکھنے میں صرف ہوئی ہی چنانچہ خواجہ محمود گاوان بھی حکم ملتے ہی کاروبار تجارت کو چھوڑ کر ایک کار آزمودہ جنرل کی طرح تلنگانہ کی طرف بڑھا اور بہت آسانی سے جلال خاں کے مستقر قلعہ نلگنڈہ کا محاصرہ کرلیا۔ دوران محاصرہ میں جلال خاں کا بیٹا سکندر خاں محمود شاہ خلجی کے واپس چلے جانے سے مایوس ہوکر دو ہزار فوج کے ساتھ کسی تدبیر سے قلعہ نلگنڈہ میں داخل ہوگیا۔ خواجہ محمود گاوان یہ دیکھ کر سمجھا کہ اُس کی مراد برآئی اور چند ہی روز میں محصورین کو اس قدر تنگ کیا کہ جلال خاں نے امان طلب کی اور قلعہ حوالہ

کرکے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو گیا جس نے خواجہ محمود گاوان کی سفارش پر پھر قلعہ نلگنڈہ اُس کو جاگیر میں دیا۔

عہد ہمایوں شاہ بہمنی

اس کے دو برس بعد سلطان علاء الدین راہی ملکِ بقا ہوا مگر اپنے ولیعہد شاہزادۂ ہمایوں کو وصیت کر گیا کہ خواجہ محمود گاوان کی قدردانی کرے۔ چنانچہ اُس نے تخت فیروزہ پر قدم رکھتے ہی محمود گاوان کو خطاب ملک التجاری عطا کرکے وکیل شاہی اور طرفدار بیجاپور مقرر کیا۔ جب سکندر خاں ولد جلال خاں نے بغاوت کی تو ملک التجار محمود گاوان بسرکردگی جمعیت بیجاپور شریک جنگ ہوا۔ اور سکندر خاں کے مارے جانے کے بعد اُس نے خواجہ جہان ترک کی مدد سے قلعہ نلگنڈہ ایک ہفتہ کے محاصرہ میں فتح کیا سکندر خاں کی بغاوت سے صوبۂ تلنگانہ میں ایک فساد برپا ہو گیا تھا اس لیئے ملک التجار محمود گاوان ہمایوں شاہ کے تمام عہد میں اس صوبہ میں لڑتا رہا اور خدا نے اُس کو اُس ظلم وستم کے دیکھنے سے محفوظ رکھا جو ہمایوں شاہ نے اپنے بھائی حسن خاں اور اُس کے علاقہ داران پر

۱؎ ہمایوں شاہ اپنے باپ کی جگہ سنہ ۱۴۵۸ء میں اپنے چھوٹے بھائی حسن خاں کی بغاوت کو فرو کرنے کے بعد تخت نشین ہوا اور سنہ ۱۴۶۱ء میں فوت ہوا۔ اُس نے اپنے بھائی حسن خاں اور اُس کے علاقہ داروں پر اس قدر ظلم کیا کہ "ظالم" کا لقب پایا اور اس لحاظ سے خاندان بہمنیہ میں اپنی آپ ہی نظیر ہوا۔

(تاریخ فرشتہ)

جن کی تعداد سات سو کے قریب تھی کیا کہ جس کی وجہ سے اُس کو ظالم کا لقب ملا اور ابد الآباد تک اُس کی یاد پر دھبّہ رہے گا۔ سنہ ۱۴۶۱ء میں رعایائے دکن کو ہمایوں شاہ کے ظلم سے نجات ملی اور اُس کے خورد سال بیٹے نظام شاہ کو شاہ محب اللہ اور سید شریف نے جو سادات عظام سے تھے تیمّناً و تبرکاً راست و چپ سے پکڑ کر تخت فیروزہ پر جلوہ گر کیا۔

نظام شاہ کی تخت نشینی اور ملکہ مخدومہ جہاں کی بیکسی

نظام[1] شاہ کی عمر اُس وقت آٹھ سال کی تھی اُس کی ماں جو مبارک خاں ابن فیروز شاہ بہمنی کی بیٹی تھی نہایت ہوشیار اور عاقل عورت تھی اُس نے ہمایوں شاہ کی وصیت کے بموجب خواجہ جہان ترک کو وکیل شاہی اور طرفدار تلنگانہ اور ملک التجار محمود گاوان کو جملۃ الملک و وزیر کل و طرفدار بیجاپور مقرر کیا۔ اور ان دونوں کے مشورے سے کاروبار سلطنت کو انجام دینے لگی۔ ہر روز صبح کے وقت خواجہ جہان ترک اور ملک التجار محمود گاوان حاضر ہوتے تھے اور تمام امور سلطنت کو ایک عورت ماہ بانو کے ذریعہ سے طے کرنے کے بعد نظام شاہ کو تخت فیروزہ پر بٹھا کر خواجہ جہان سیدھے ہاتھ

---

[1] نظام شاہ ہمایوں شاہ کا بیٹا اُس کی بجگہ سنہ ۱۴۶۱ء میں آٹھ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا حسن و جمال میں بے نظیر تھا عین بزم شادی دامادی میں تخت کی رات کو سنہ ۱۴۶۳ء میں فوت ہوا (تاریخ فرشتہ)

کی طرف اور ملک التجار بائیں ہاتھ کی طرف کھڑا رہتا تھا اور تمام کاموں کو عمدگی سے انجام دیتے تھے۔

نظام شاہ کی والدہ جس کا اصلی نام نرگس بی تھا مگر جو سلاطین بہمنیہ کی اصطلاح کے بموجب تاریخ میں ملکہ مخدومہ جہان کے لقب سے یاد کی جاتی ہی ایک عجیب و غریب لیاقت کی عورت تھی اور اُس کے کارنامے اُن یورپین مصنفوں کا جواب ہیں جو مسلمانوں پر الزام لگاتے ہیں کہ عورتوں کو غلامی کا خوگر بنا کر اُن کے دماغوں کو تباہ کرتے ہیں۔ وہ نہایت دوربیں اور تیز ہوش تھی اور معاملات ملکی کو ایسا سمجھتی تھی کہ بہت کم لوگ سمجھتے ہوں گے۔ اُس کا عزم راسخ اور حوصلہ بلند تھا۔ نرگس بی عورات دکن میں بلحاظ سیاست ریاست کے اُسی طرح سر برآوردہ ہی جس طرح کہ چاند بی جرأت و استقلال میں ہی مگر افسوس ہی کہ گو اُس کا عالی شان مقبرہ اُس کی عظمت و شان کے یاد دلانے کے لیے ابھی تک شہر بیدر میں موجود ہی مگر اُس کے کارنامے اہل دکن کے لوحِ دل سے محو ہو گئے ہیں۔

رائے اوڑیسہ کی چڑھائی

جب گرد و نواح کے بادشاہوں کو معلوم ہوا کہ ایک خورد سال بچہ تخت سلطنت پر متمکن ہی تو ہر شخص نے نظر طمع کو دراز کیا مگر سب

رائے اُڑیسہ نے پیش قدمی کی جب یہ خبر محمد آباد بیدر میں پہونچی تو ملکہ مخدومہ جہان نے ملک التجار محمود گاوان اور خواجہ جہان ترک کے مشورے سے چالیس ہزار فوج جمع کرکے نظام شاہ کو اُس کے مقابلے میں بھیجا اور اُس نے رائے اُڑیسہ کو شکست دی اور خواجہ جہان نے رائے اوڑیسہ کا تعاقب کرکے اس قدر مجبور کیا کہ آخر کار اُس نے ملک التجار محمود گاوان کے پاس قاصد بھیجے اور بہت کچھ نامہ و پیام کے بعد پانچ لاکھ ہُن دے کر صلح کی اور اپنے ملک کا راستہ لیا۔

محمود شاہ خلجی کی چڑھائی اور اہل دکن کی شکست

ابھی اس بلا سے نجات نہ ہوئی تھی کہ محمود شاہ خلجی[9] والی مالوہ نے فوج کشی کی اور خواجہ جہان اور ملک التجار فوج تلنگانہ کو رائے اُڑیسہ کے مقابلہ کے لیۓ چھوڑ کر لشکر بیجاپور و دولت آباد و برار کو ہمراہ رکاب نظام شاہ لیکر اُس کے مقابلے کے لیۓ روانہ اور قلعۂ قندھار کے نزدیک دوچار ہوئے[10]۔ محمود شاہ خلجی ایک تجربہ کار جنرل تھا اُس نے اپنا کیمپ

---

[9] محمود شاہ خلجی تخت مالوہ پر ۱۴۳۶ء میں بیٹھا اور اتنیس برس حکمراں رہ کر ۱۴۶۹ء میں فوت ہوا۔ وہ نہایت عادل و منصف مزاج اور بڑا اولوالعزم بادشاہ تھا۔ اُس کی تمام عمر ممالک غیر کی چڑھائی کرنے میں صرف ہوئی۔ اسلام کا سچا پیرو اور دلدادہ تھا (تاریخ فرشتہ)

[10] اس لڑائی کی کیفیت تاریخ فرشتہ اور مآثر برہانی سے لی گئی ہے۔

ایک نہایت مستحکم مقام میں قایم کرکے بنظر احتیاط اُس کے گرد ایک گہری خندق کھدوادی تھی۔ نظام شاہ اگرچہ خوردسال تھا مگر دشمن کی فوج کو دیکھکر ایسا جوش میں آیا کہ ترکش کمر میں باندھ اور تلوار پرتلہ میں حائل کرکے نہایت چستی و چالاکی سے صفوفِ جنگ کی آراستگی میں مصروف ہوا۔ ملک التجار محمود گاوان کو دس ہزار سوار اور چالیس زنجیر فیل کے ساتھ میمنہ میں جگہ دی اور نظام الملک ترک کو اسی قدر فوج کے ساتھ میسرہ میں مقرر کیا اور خود خواجہ جہان ترک اور سکندر خاں کے ساتھ جو اُس کا کوکا تھا گیارہ ہزار سوار اور ایک سو زنجیر فیل کے ساتھ قلب میں کھڑا ہوا۔ دوسری طرف محمود خلجی نے اپنے بیٹے سلطان غیاث الدین کو میمنہ میں قایم کیا اور میسرہ کو مہتاب خاں حاکم چندیری اور ظہیر الملک کے سپرد کیا اور بذات خود فوج خاصہ کے ساتھ قلب کو مستحکم کیا دونوں فوجیں صف بستہ نقارۂ جنگ کی دل ہلانے والی صدا کی منتظر ایک دوسری کی مقابل کھڑی تھیں کہ ملک التجار شمشیر برہنہ ہاتھ میں لیے ہوئے لشکر بیجاپور کے ساتھ محمود خلجی کی میسرہ پر حملہ آور ہوا۔ اگرچہ مہتاب خاں اور ظہیر الملک نے ابتدا میں جرأت سے مقابلہ کیا مگر جب زیادہ سختی ہوئی تو حملہ کی تاب نہ لاکر بے تحاشا پیچھے ہٹے اور بھاگتے ہی بھاگتے مارے گئے۔ یہ حالت دیکھکر نظام الملک ترک

سے بھی نہ رہا گیا اُس نے بیتاب ہو کر نعرۂ "اللہ اکبر" لگایا اور سلطان غیاث الدین
پر جا پڑا۔ پھر کیا تھا خوب جنگ و جدل ہونے لگی۔ سلطان غیاث الدین
ایک مشہور بہادر تھا جو اکثر لڑائیوں میں ناموری حاصل کر چکا تھا اتفاق سے
عین ہنگامہ کارزار میں نظام الملک ترک سے دوچار ہو گیا اور دونوں
بلا اس کے کہ ایک دوسرے کو پہچانیں آپس میں لڑنے اور گرز اور تلواریں
چلانے لگے نظام الملک کی تلوار ایسی بے موقع پڑی کہ پھل قبضے سے جدا ہو کر
زمین پر گرا مگر وہ منجھا ہوا سپاہی تھا اُس نے قبضے ہی کو پھینک کر سلطان
غیاث الدین کے منہ پر مارا جو ٹھیک اُس کی آنکھ پر اس زور سے لگا کہ
خون بہنے لگا۔ نظام الملک ترک نے دشمن کو بدحواس دیکھا گھوڑے
سے گرا دیا اور اس فکر میں تھا کہ اپنے رہوار کے سموں سے اُس کا کام تمام
کر دے کہ اتنے میں محمود خلجی کی فوج کے چند سپاہی آ گئے اور اپنے شاہزادے
کو ایسی ردی حالت میں دیکھ اُٹھا کر خیمہ گاہ کی طرف سراسیمہ بھاگے۔ دکنیوں
نے تعاقب کیا اور فرودگاہ میں پہونچکر مال و اسباب لوٹا اور پچاس ہاتھی
گرفتار کیے۔ محمود خلجی اپنے فوج کے دو دستوں کے اس طرح منتشر ہو جانے سے
بہت ہراساں ہوا اور قریب تھا کہ بازگشت کا حکم دے کہ اُس کے ایک

مصاحب نے اُس کو روکا اور استقلال سے کام لینے کا مشورہ دیا۔ ملک التجار اور نظام الملک کی کارگزاریوں کو دیکھ کر نظام شاہ کی رگ حمیت نے جنبش کی اور اُس نے چاہا کہ خود بھی فوج خاصہ کے ساتھ محمود خلجی پر حملہ آور ہو کہ اتنے میں خواجہ جہان ترک دس ہزار سواروں اور چند مشہور ہاتھیوں کے ساتھ آگے بڑھا۔ محمود شاہ نے بارہ ہزار سواروں کے ساتھ اُس کا مقابلہ کیا اور چونکہ خود بھی کارآزمودہ شخص تھا اُس نے اس قوی دستہ کو موج طوفانی کی طرح اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر کمان اُٹھائی اور سکندر خاں غلام کے ہاتھی کی پیشانی پر جو نظام شاہ کے نزدیک کھڑا تھا ایسا تیر مارا کہ وہ غصے میں آکر دیوانہ وار ادھر اُدھر دوڑنے لگا جس سے فوج دکن کو بہت صدمہ پہونچا اور قریب تھا کہ خود نظام شاہ کو بھی ضرر پہونچے کہ سکندر خاں نے یا تو بے عقلی سے یا خواجہ جہان ترک کی دشمنی سے اپنی فوج کو حملہ کا حکم نہ دیا اور وہ سخت غلطی کی کہ جس کی وجہ سے سیکڑوں کامیاب لڑائیاں شکست سے مبدل ہو گئی ہیں یعنی نظام شاہ کو اپنے ہمراہ لیکر میدان جنگ سے نکل گیا۔ جب فوج دکن نے میدان جنگ کو اعلام شاہی سے خالی پایا تو بد دل ہو کر جنگ سے ہاتھ روکا۔ اور خواجہ جہان نے بھی یہ دیکھ کر کہ افواج میمنہ و میسرہ تو

دشمن کے تعاقب میں منتشر ہو چکی ہیں اور اعلام و چتر شاہی جن سے فوج کی ہمت بندھی ہوئی تھی نظر سے غائب ہیں۔ میدان جنگ میں ٹھہرنا حماقت سمجھا اور نہایت ہوشیاری سے اسپ و فیل شاہی کو سلامت نکالکر محمد آباد بیدر کی راہ لی۔ ملک التجار محمود گاوان اور دوسرے امراء دکنی و حبشی کو بھی قسمت کو مخالف دیکھ کر فرار کو ذریعۂ امن سمجھنا پڑا۔ جب یہ ہزیمت خوردہ فوج بہ ہزار خرابی محمد آباد بیدر میں پہونچی تو وہاں بھی صورت امن نہ دیکھ کر ملکہ مخدومہ جہاں ملک التجار محمود گاوان کے مشورہ سے خزانہ شاہی و عورات حرم اور نظام شاہ کو لیکر فیروز آباد چلی گئی اور قلعہ ارک کو ملو خاں دکنی کے سپرد کر گئی۔

اس کامیابی نے محمود شاہ خلجی کے لئے راستہ صاف کر دیا چند ہی روز میں فتح کے پرچم اڑاتا ہوا محمد آباد بیدر میں داخل ہوا اور تھوڑے عرصہ میں ممالک برار و بیڑ و دولت آباد پر قابض و متصرف ہو گیا۔ ملک التجار محمود گاوان بھی غافل نہ تھا اس وقت تک قرب و جوار کی سلطنتوں اور ان کی آپس کی رقابت سے بخوبی واقف ہو چکا تھا اس لئے اس نے ملکہ مخدومہ جہاں کی اجازت سے نظام شاہ کی طرف سے ایک خط

سلطان محمود[۵] شاہ والی گجرات کو بہ طلب مدد لکھا جس کا اثر محمود شاہ گجراتی کے

محمود شاہ گجراتی کی مدد سے محمود شاہ خلجی کا دکن سے نکلنا

دل پر یہ ہوا کہ وہ خود فوراً اسی ہزار سوار ہمراہ لیکر سرحد دکن کی طرف بڑھا۔ ملکہ مخدومہ جہاں نے پہلے ہی سے یہ کیا تھا کہ کچھ فوج جمع کر کے خواجہ جہان کو محمود شاہ خلجی کے مقابلے کے لیئے بھیج دیا تھا اور جب سلطان محمود شاہ گجراتی کے آنے کی خبر سنی تو ملک التجار محمود گاوان کو سپہ سالار مقرر کر کے پانچ چھ ہزار سوار کے ہمراہ استقبال کے لیئے بیڑ کی راہ سے روانہ کیا اور اُس نے بیس ہزار سوار ملک التجار کے حوالہ کیئے۔ ملک التجار نے آس پاس آدمی دوڑا کر کچھ اور فوج بھی جمع کر لی اور چالیس ہزار سواروں کے ساتھ محمد آباد بیدر کی طرف بڑھا جہاں ابھی تک محمود شاہ خلجی قلعہ ارک کی تسخیر کرنے کی تدبیریں کر رہا تھا۔ جب محمود خلجی کو ملک التجار گاوان کے اتنی کثیر فوج کے ساتھ محمد آباد بیدر کی طرف بڑھنے کی خبر معلوم ہوئی تو وہ مقابلہ کو

---

[۵] محمود شاہ گجرات کا بادشاہ تھا وہ چودہ سال کی عمر میں ۱۴۵۸ء میں تخت نشین اور ۱۵۱۱ء میں فوت ہوا وہ ایک بہت تیز فہم ہوشیار اور اولوالعزم بادشاہ تھا اور پکا مسلمان تھا یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس زمانہ میں تین بادشاہوں کا نام محمود شاہ تھا یعنی محمود شاہ شرقی والی جونپور۔ محمود شاہ خلجی والی مالوہ اور محمود شاہ گجراتی والی گجرات۔ اور اتفاق سے گو والی دکن کا نام محمود شاہ نہ تھا مگر مختار کل کا نام محمود تھا۔ اور یہ چاروں اولوالعزم شخص اپنے حسن اخلاق کے لحاظ سے اسم بامسمیٰ بھی تھے۔ (تاریخ فرشتہ)

خطرہ سے خالی نہ سمجھ کر بلا توقف اپنے ملک کی طرف روانہ ہو گیا۔ مگر ملک التجار اُسے کہاں جانے دیتا تھا ہر طرف سے اُس کا تعاقب کیا اور اس قدر تنگ کیا کہ اُس کو ایلچپور و اکلکوٹ کے دشوار گزار راستے سے بھاگنا پڑا گو کہ اثنا راہ میں ہزاروں سپاہی بھوک اور پیاس کی شدّت سے فوت ہوئے۔ اس نمایاں کامیابی کے بعد نظام شاہ کی طرف سے محمود شاہ گجراتی کو شکریہ کا خط لکھا گیا اور بہت سے تحفہ تحایف بھیجے گئے جن میں قیمتی ہاتھی اور گھوڑے بھی تھے جس کے بعد محمود شاہ گجراتی اپنی سچی ہمدردی کا نمایاں ثبوت دے کر اپنی دارالسلطنت احمد آباد کو واپس ہوا۔ محمود شاہ خلجی ملک التجار محمود گاوان پر ایسا خار کھائے ہوئے تھا کہ اپنی شکستہ حالت کو درست کرنے کے بعد سنہ ۱۴۶۲ء میں ۹۰۰۰ (نوے ہزار) سوار کے ساتھ ملک دکن پر حملہ آور ہوا مگر پھر پہلے ہی قصّے کا اعادہ ہوا ملک التجار کی تحریک پر محمود شاہ گجراتی مدد کے لیے آموجود ہوا۔ اور محمود شاہ خلجی کو ناکام گونڈواڑہ کی راہ سے اپنے ملک کو بلا جنگ و جدال واپس ہونا پڑا۔ اس کے بعد ملکہ مخدومہ جہاں نے نظام شاہ کی شادی کا بہت دھوم دھام سے بندوبست کیا مگر خدا کی قدرت کہ بزم شادی مجلس عزا سے مبدّل ہو گئی اور عین تخت کی رات کو نظام شاہ نے عالم فانی سے ملک جاودانی کا راستہ لیا۔

محمد شاہ کی تخت نشینی اور خواجہ جہاں ترک کا قتل

نظام شاہ کے بعد اُس کا بھائی محمد شاہ تخت فیروزہ پر جلوہ گر ہوا جس کی عمر اُس وقت صرف نو برس کی تھی کونسل آف ریجنسی بسر کردگی ملکہ مخدومہ جہاں حسب سابق قایم ہوئی مگر خواجہ جہاں ترک بے اندازہ قوت ہاتھ میں دیکھ کر آپے سے باہر ہو گیا امراء قدیم کی جاگیریں چھین کر اپنی حکومت کے استقلال کی خاطر امراء جدید کو دینے لگا اور خزانہ عامرہ تک اُس کے دست تصرف سے محفوظ نہ رہا۔ ملک التجار محمود گاوان کو ایک منٹ دار السلطنت میں ٹھہرنے نہ دیتا اور ہمیشہ فوجوں کے ساتھ سرحد پر بھیجتا رہتا تھا۔ نخوت کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑوں کو بے حقیقت سمجھتا تھا۔ ملکہ مخدومہ جہاں تو محمود شاہ خلجی کے واقعہ کے وقت سے ہی اُس سے بددل تھی اب تو اور بھی بیزار ہو گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس اولو العزم عورت نے دل میں ٹھان لیا کہ خواجہ جہان کا وجود سلطنت بہمنیہ کے حق میں مضر ہے۔ آخر کار سنہ ۱۴۶۶ء میں اُس نے اپنے بیٹے [1] محمد شاہ کو اُس کے قتل پر آمادہ کیا ایک روز خواجہ جہان ترک حسب معمول

---

[1] سلطان محمد شاہ بعمر ۹ سال اپنے بھائی نظام شاہ کی جگہ سنہ ۱۴۶۳ء میں تخت نشین ہوا۔ اُس کے زمانہ میں سلطنت دکن کو سب سے زیادہ وسعت حاصل ہوئی مگر اُس کے اخیر زمانہ میں تمام سرداروں نے خودسری و خود مختاری اختیار کی سنہ ۱۴۸۲ء میں فوت ہوا۔ (تاریخ فرشتہ)

دربار میں آیا مگر کیا دیکھتا ہی کہ اُس روز نظام الملک ایک کثیر فوج لیئے دیوانخانہ میں موجود ہی اگرچہ اس سے کچھ متفکر ہوا مگر سوائے اس کے چارہ نہ تھا کہ محمد شاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر آداب و مجرا بجا لائے۔ غرضکہ وہ معمولی کاروبار میں مشغول ہی تھا کہ اتنے میں دو عورتیں محل سے برآمد ہوئیں اور اُنھوں نے محمد شاہ سے مخاطب ہو کر بآواز بلند کہا کہ جو قرارداد ہوئی ہی اُس کو پورا کیا جائے۔ یہ سُنتے ہی محمد شاہ نے نظام الملک ترک سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا کہ "اُس حرام خور کو فوراً قتل کر ڈال" نظام الملک تو حکم ہی کا منتظر تھا فوراً خواجہ جہان ترک کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے گیا اور تلوار غلاف سے نکال کر اپنے ہی ہاتھ اُس کا کام تمام کیا۔

محمود گاوان کا عروج خواجہ جہان کے قتل کے بعد ملک التجار محمود گاوان کے سوا کوئی شخص ایسا باقی نہ رہا جو مہمات سلطنت کو باحسن وجوہ انجام دے سکے اس لیئے اُس کو خلعت خاص و خطاب خواجہ جہان و منصب امیر الامرائی و وکالت امور شاہی عطا ہوا اور مراتب دُنیوی میں اُس کا پایہ سب سے اعلیٰ ہو گیا اس وقت خواجہ جہان محمود گاوان فرامین شاہی میں اس طرح پر مخاطب کیا جاتا تھا "مخدوم جہانیان معتمد درگاہ سلطان آصف جم نشان امیر الامرا

ملک نائب مخدوم خواجہ جہان"

محمد شاہ کی شادی اسی سال ملکہ مخدومہ جہاں نے خواجہ محمود گاوان کی مدد سے اپنے دل کی آخری ہوس کو بھی نہایت ہی تزک و احتشام سے انجام دیا یعنی اپنے لخت جگر محمد شاہ کی شادی نہایت ہی دھوم دھام سے دودمان بہمنیہ کی ایک لڑکی سے کی اور چونکہ اب محمد شاہ سن رشد کو پہونچ گیا تھا اس لیئے خود گوشہ گیری اختیار کرکے مہمات سلطنت کو اُس کے سپرد کیا۔ اگرچہ محمد شاہ کا کوئی کام ایسا نہیں ہے جس میں خواجہ جہان محمود گاوان کی شرکت نہ ہو مگر اس مقام پر بنظر اختصار صرف اُن واقعات کا ذکر کیا جائے گا جن سے براہ راست خواجہ جہان کو تعلق تھا۔

مہم کوکن و فتح گوا سنہ ۱۴۶۹ء میں خواجہ جہان محمود گاوان نہایت شان و شوکت سے لشکر بیجاپور و خبیر و جاگنہ و کلہر و داہول و جیول و باہن وغیرہ کو ہمراہ لیکر فتح کوکن کی طرف متوجہ ہوا۔ رائے سنگیسر ایک بہت ذیشان راجہ اور بحری ڈاکوؤں کا سرگروہ تھا اُس کے زیر حکومت تین سو جنگی کشتیوں کا ایک بیڑا تھا اور فوج کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی۔ جب اُس کو خواجہ جہان محمود گاوان کے ارادے سے اطلاع ہوئی تو اُس نے گھاٹ کی راہوں کو مسدود

کر دیا۔ محمود گاوان اب تو ایک منجھا ہوا جنرل تھا اُس نے اس مسدودی راہ کی پرواہ نہ کی اور اطمینان خاطر سے دامن کوہ میں قیام کیا اور آہستہ آہستہ تھوڑے عرصہ میں گھاٹ کو ہنود کے تصرّف سے نکال لیا۔ جب پہاڑی راستوں کی دشوارگزاری دیکھ کر سمجھا کہ سواروں کا کام نہیں ہی تو جو لشکر کہ ساتھ لایا تھا اس کو واپس کیا اور اُن کی بجائے سعید خاں گیلانی کو لشکر جنیر کے ساتھ اور اپنے غلام خوش قدم کو لشکر واہول و کلہر کے ساتھ طلب کیا اور چند ہی روز میں پیادوں کی کثیر فوج جمع کر لی۔ قلعہ کہنہ کے نزدیک گھنا جنگل تھا جس سے فوج کی راہ مسدود ہو گئی تھی اس لیئے جلا کے خاک سیاہ کیا اور قلعہ کا محاصرہ کیا جس کو ابھی پانچ ہی مہینے گزرے تھے کہ موسم برسات آگیا اس لیئے جاہ و حشم کے ساتھ گھاٹ سے اُتر آیا اور پرگنہ کولہاپور میں پھونس کے جھونپڑے فوج کے لیئے ڈال کر رہنے لگا اور گھاٹ کی حفاظت کے لیئے دو ہزار پیادے اور توپچی و تیرانداز چھوڑ آیا۔ لیکن موسم کی سختی بھی محمود گاوان کو روک نہ سکتی تھی اُس نے اس زمانہ بیکاری میں قلعہ رامکنہ کو فتح کر کے جی بہلایا۔ برسات کے بعد گھاٹ پر چڑھائی ہوئی اور کئی مہینے کی کوشش اور کشش میں اور ہزارہا حیلہ و تدبیر اور لاکھوں روپیہ پانی کی طرح بہا اور رائے سنگمیسر کے سرداروں کو

قسم قسم کے تحفہ تحائف دے کر قلعۂ کہنہ کو جس کی سنگین دیواروں پر اُس وقت تک علم اسلام کا سایہ نہ پڑا تھا فتح کیا چونکہ اسی اثناء میں موسم برسات آگیا اس لیئے پھر حسب سابق گھاٹ کی حفاظت پیادوں کے سپرد کر کے سواروں کو ہمراہ لیکر نیچے اُتر آیا اور چار مہینے کے بعد سنگمیسر کی طرف متوجہ ہوا جس کو بہت ہی آسانی سے فتح کر کے اُس طرف کے زمینداروں سے ملک التجار خلف حسن بصری کے خون ناحق کا انتقام لیا اور رعایا کو مطیع و فرماں بردار بنانے کے بعد گوا[1] کی طرف بڑھا جو راجہ بیجانگر کا مشہور بندر تھا چونکہ راجہ بیجانگر بحری فوج کا بھی مالک تھا اس لیئے خواجہ جہان محمود گاوان نے بھی ایک سو بیس جہازوں کا بیڑا تیار کر کے تری سے حملہ کرنے کے لیئے بھیجا اور خود خشکی کی طرف سے بڑھا۔ ابھی راجہ بیجانگر کو محمود گاوان کی عزیمت کی اطلاع بھی نہ ہوئی تھی کہ اُس کی حفاظت کے لیئے فوج بھیجتا کہ اُس نے بجلی کی طرح اُس پر قبضہ کر لیا اس نمایاں فتح کی خبر شہر بشہر پھیل گئی اور اُس کے سُننے سے محمد شاہ بہمنی اس قدر خوش ہوا کہ ایک ہفتہ تک طبل شادی محمد آباد بیدر میں بجوایا۔ جب اس نمایاں کامیابی کے بعد خواجہ جہان محمود گاوان قلعہ گوا کی حفاظت کا بندوبست کر کے تین سال

---

[1] ریاض الانشاء و تاریخ فرشتہ

محمود گاوان کی قدر و منزلت

کے بعد فتح و نصرت کے ساتھ محمد آباد بیدر میں داخل ہوا تو اُس کی اس قدر توقیر ہوئی کہ بادشاہ ایک مہینہ تک اُس کے یہاں مہمان رہا اور خلعت خاص عنایت کیا اور ملکہ مخدومہ جہاں نے اُس کو ”بھائی“ کے لقب سے مخاطب کیا اور چند فقرے اُس کے القاب میں بڑھائے گئے جس کے بعد وہ اس طرح پر مخاطب کیا جانے لگا۔

”حضرت مجلس کریم سیّد عظیم ہمایوں اعظم صاحب السیف والقلم مخدوم جہانیان معتمد بارگاہ سلطان آصف جم نشان امیرالامرا الملک نائب مخدوم ملک التجار محمود گاوان المخاطب بہ خواجہ جہان“

سلطان محمد شاہ نے خواجہ جہان کے غلام خوش قدم کی بھی قدر و منزلت کی جس نے اس تین برس میں خواجہ جہان کی بہت خدمت گزاری کی تھی اور اُس کو کشور خاں کا خطاب دے کر امراء کلاں میں داخل کیا اور قلعہ گوا و بندہ و گوندوال و کولہاپور کو اُس کی جاگیر میں اضافہ کیا۔

یہ ایک عظیم الشان فتح تھی اور اُس کا خواجہ محمود گاوان کے دل پر ایسا عمیق اثر ہوا کہ اُس کی انشاء کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ ایران و توران کے جن جن سلاطین اور عمائد سے اُس کی خط و کتابت تھی اُن

سب کو اُس کی تفصیلی کیفیت لکھی[1] ۱۴۷۲ء میں خبر پہونچی کہ رائے پرکیتہ نے اجیرائے راجہ بیجانگر کی تحریک سے بندر گوا پر حملہ آور ہونے کا قصد کیا ہی اور قلعدار بنکاپور بھی بہت سا لشکر لیکر اُسی طرف بڑھ رہا ہی۔

فتح قلعہ بلگواں محمد شاہ کو جب یہ خبر پہونچی تو وہ بھی اپنا لشکر لیکر قلعہ بلگوان جس کو اب بلگاؤں اور انگریزی میں بلگام کہتے ہیں) کی طرف جو بہت ہی مضبوط و مستحکم تھا بڑھا اور اُس کا محاصرہ کرلیا راجہ پرکیتہ صاحب بلگوال نے یہ دیکھکر خواجہ جہان محمود گاوان اور دوسرے مقربین کے ذریعہ سے عذر خواہی کی لیکن چونکہ بادشاہ کو اُس طرف کے سرکش لوگوں کو ایک سبق پڑھانا منظور تھا اس لیئے اُس کی درخواست پر کوئی توجہ نہ کی اور آتشبازوں کو بلاکر حکم دیا کہ اگر اپنی جان کی سلامتی چاہتے ہو تو دو ہفتہ میں قلعہ کی دیواروں کا نام بھی باقی نہ رہے اور خندق کو بھرنا خواجہ جہان کے سپرد کیا تاکہ جس روز دیواریں زمین سے پیوست ہوں اُسی دن خندق بھی بھری ہوئی رہے۔
لیکن ہر چند خواجہ جہان خندق کے بھرنے کی کوشش کرتا تھا مگر کسی تدبیر نے کام نہ کیا کیونکہ دن میں جس قدر بھری جاتی تھی رات کے وقت محصورین اُس کو

---

[1] ریاض الانشا۔۔

صاف کر دیتے تھے۔ یہ دیکھ کر خواجہ جہان نے غور کیا اور قلعہ کے مقابلہ میں ایک دیوار اُٹھا کر جا بجا مورچے قایم کیئے اور یوسف عادل خاں اور فتح اللہ عماد الملک کے مورچوں سے قلعہ کے بُرج کے نیچے تک سرنگ بنوا کر اُس میں باروت بھروائی چونکہ دکن میں یہ پہلا موقع تھا کہ ایسا طریقہ اختیار کیا گیا اس لیئے رائے پرکتیہ بے خبر بیٹھا ہوا تھا کہ سرنگ کو شتابہ دکھایا گیا اور دفعتًا قلعہ کی دیواریں کئی مقامات سے زمین سے آملیں۔ خندق تو پہلے ہی سے بھری ہوئی تھی فوج شاہی دوڑ پڑی اور قلعہ کے اندر گھُسنے کی تدبیریں کرنے لگی مگر محصورین نے بھی جان توڑ کر مقابلہ کیا اور فوج شاہی سے قریبًا دو ہزار آدمی کام آئے آخر کار محمد شاہ نے خود سوار ہو کر سخت حملہ کیا اور بیرونی حصار پر قبضہ کر کے ارک قلاع کے محاصرے میں مصروف ہوا۔ رائے پرکتیہ تو پہلے ہی سے بددل ہو رہا تھا وہ یہ دیکھ کر بہ تبدیل لباس حاضر ہو گیا اور محمد شاہ نے فیاضی سے اُس کا قصور معاف کر کے طبقۂ امراء میں داخل کیا۔

بیجانگر پر ایک نئے خاندان کی حکومت اور محمد شاہ کی چڑھائی

سنہ ۱۴۷۹ء میں ملک ارجن اور ورو پاکشا کی پیہم شکستوں کی وجہ سے بیجانگر میں ایک نئے خاندان کی حکومت

قایم ہوئی جس کے پہلے راجہ کا نام نرسنگھ تھا جو بیان کیا جاتا ہی کہ وہ رچاکتا کا غلام تھا۔ سنہ ۱۴۸۰ء میں محمد شاہ نے سلطنت بیجانگر پر حملہ کیا۔ راستہ میں سلطان نے ایک پہاڑی پر ایک قلعہ دیکھا جو مسمار پڑا ہوا تھا دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ قلعہ بادشاہان دہلی نے اپنی سرحد کی حفاظت کے لیے تعمیر کیا تھا۔ محمد شاہ نے یہ سن کر اس کی تعمیر و مرمت کا حکم دیا اور یہ کام خواجہ جہان محمود گاوان کے سپرد کیا۔ خواجہ جہان محمود اپنی معمولی مستعدی سے اس کام کی طرف بھی متوجہ ہوا اور چھ مہینہ کے قلیل عرصہ میں وہ کام کیا جو دوسرے سے دو برس میں بھی نہ ہو سکتا۔ یعنی ایک شاندار مستحکم عمارت کھڑی کر دی دیواروں پر خاراشگاف توپیں چڑھا دیں اور قلعہ میں ہر قسم کی رسد کا سامان جمع کر دیا اور اس کے بعد محمد شاہ کو لا کر تمام چیزیں اس کی نظر سے گزرانیں محمد شاہ اس قدر خوش ہوا کہ کہنے لگا کہ خدا کا مجھ پر بڑا فضل و کرم ہی کہ ایک تو اس نے شاہی و ریاست عطا فرمائی دوسرے خواجہ جہان جیسا نوکر عنایت کیا اور از راہ خوشنودی خواجہ جہان کو اپنا لباس پہنایا اور خواجہ کا لباس خود پہنا۔ یہ ایسی عزت تھی کہ آج تک کسی بادشاہ نے نوکر کی نہیں کی یہاں تک تو خواجہ جہان محمود گاوان کے ان کارناموں کا ذکر

کیا گیا جو اُس سے میدان جنگ میں ظہور پذیر ہوئے اب مناسب معلوم ہوتا ہی کہ ایک سرسری نظر سلطنت بہمنیہ کی عام حالت پر بھی ڈالی جائے تاکہ ناظرین کو اس کتاب کے پوری طرح پر سمجھنے میں آسانی ہو۔

سامان شاہی تاریخ اسلام میں خلفاء عباسیہ کی بدولت سیاہ رنگ کو وہ شرف و امتیاز حاصل ہی کہ جب کبھی کسی اولوالعزم شخص نے داعیۂ سلطنت کیا ہی تو نشان شاہی کے خیال سے اُس کی آنکھیں نے اختیار اسی رنگ پر پڑی ہیں۔ جب ۱۳۴۷ء میں امراء دکن نے سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی کو تخت شاہی کے لیئے منتخب کیا تو اُنھوں نے تیمنًا و تبرکًا اسی رنگ کو اُس کا نشان قرار دیا اس لیئے سلاطین بہمنیہ کا چتر اور سراپردہ و دہلیز سیاہ ہوتے تھے۔

سلطان علاء الدین حسن کی سلطنت کی بنیاد انتخاب پر تھی اور نہ اُس کے پاس زیادہ سرمایہ تھا۔ اس لیئے اُس نے تزک و احتشام کی طرف جو ایشیا میں قدیم الایام سے شخصی سلطنت کی بنیاد سمجھا جاتا ہی اور جس کو حقیقت میں بھی شخصی رعب وداب کے قایم رکھنے میں بہت کچھ دخل ہی توجہ نہیں کی لیکن اُس کے بیٹے محمد شاہ نے سب سے پہلے اپنے خیال کو اسی طرف

رجوع کیا اور اُس کے بعد جتنے بادشاہ ہوئے وہ اُس کی تکمیل میں کوشش کرتے رہے۔ لیکن چونکہ بانی خاندان سلاطین دہلی کا پروردہ تھا اور اس لیئے اُس دربار کے رسم و رواج کو سلاطین بہمنیہ اپنے لیئے آیہ ہدایت سمجھتے تھے ہندوستان میں قدیم سے یہ چیزیں سامان شاہی سمجھی جاتی ہیں۔ (۱) **چتر** (۲) **تاج** (۳) **تخت** (۴) **اسپ** (۵) **فیل** (۶) **میانہ** اور سلاطین بہمنیہ ان سب کی عمدگی اور نفاست کو اپنی سلطنت کے استحکام کے لیئے ضروری سمجھتے تھے۔

چتر۔ سیاہ ریشمی کپڑے کا تھا اور اُس کا قبہ قسم قسم اور رنگ برنگ کے جواہرات بیش بہا سے آراستہ تھا۔ اور اُس کے کلس پر ہما کی ایک مرصع مورت نصب کی گئی تھی جس کے سر پر بطور تاج کے ایک بہت بڑا خوش آب یاقوت لگا یا گیا تھا جو رائے بیجانگر نے سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی کو نذر دیا تھا اور جس کی قیمت کی تشخیص سے جوہریان دکن عاجز تھے۔

تخت۔ سلطان علاء الدین حسن کا تخت تو چاندی[1] کا تھا لیکن اُس کے بیٹے محمد شاہ کے زمانہ میں رائے تلنگانہ نے ایک تخت جو اُس نے محمد شاہ

---

[1] اس تخت کو سلطان فیروز شاہ بہمنی نے مکہ معظمہ بھیج دیا جہاں اُس کے ٹکڑے سادات کو تقسیم کیئے گئے (تاریخ فرشتہ)

تغلق کی نذر کرنے کے لیئے تیار کرایا تھا ہدیتاً بھیجا اور یہی تخت اخیر وقت تک سلاطین بہمنیہ کے لیئے باعث افتخار رہا۔ یہ آبنوس کی لکڑی کا تھا اور ایسی ترکیب سے بنایا گیا تھا کہ اُٹھاتے وقت اُس کا تختہ تختہ جدا ہو جاتا تھا۔ طول میں ۳ گز اور عرض میں اڑھائی گز تھا اور اوپر کی طرف سونے کی پتیاں جڑی ہوئی تھیں جو فیروزہ کی مینا سے مرصع تھیں اسی وجہ سے اُس کا نام تخت فیروزہ رکھا گیا تھا لیکن بعد میں سلاطین بہمنیہ کی شاوہ پسندی سے اتنے بیش قیمت جواہرات نصب ہو گئے کہ مشکل ہی سے اسم بامسمیٰ معلوم ہوتا تھا۔ محمد شاہ رائے تلنگانہ کے اس ہدیہ سے اس قدر خوش ہوا تھا کہ چالیس روز تک جشن عام کیا سلطان محمود شاہ ثانی المتوفی ۱۵۱۸ء کے عہد میں اس کی قیمت کا اندازہ ایک کروڑ ہُن یعنی ساڑھے تین کروڑ روپیہ کا کیا گیا تھا[۱]۔

تاج۔ تاج شاہی سونے کا تھا اور یاقوت والماس ومروارید سے مرصع تھا۔ اس کی قیمت ۴ لاکھ ہُن یعنی چودہ لاکھ روپیہ کا تھی[۲]۔

---

[۱] محمود شاہ ثانی کو سلطنت و ریاست کی بہ نسبت بزم نشاط کا زیادہ شوق تھا اس لیئے اُس نے تخت فیروزہ سے جواہرات نکلوا کر حاشیہ بساط و صراحی و پیالۂ شراب و طنبورِ خاص کو مرصع کرایا اور اس طرح پر یہ قابل یادگار چیز برباد ہوئی۔ (تاریخ فرشتہ)

[۲] احمد شاہ ثانی (المتوفی ۱۵۲۰ء) اس تاج کے جواہرات بیچ کر اپنے خرچ میں لایا (تاریخ فرشتہ)

اسپ۔ شاہان بہمنیہ کے اصطبل میں گھوڑے عربی و عراقی و عجمی ہر قسم کے رہتے تھے اور اُن کا سامان مثل زین و لگام مرصع ہوتا تھا۔

فیل۔ شاہان بہمنیہ کے یہاں ہاتیوں کی کمی نہ تھی محمد شاہ اول نے تو تین ہزار ہاتھی جمع کیے تھے مگر بعد میں بھی دو ہزار زنجیر فیل سے کم کسی وقت میں نہ تھے فیل خاصہ کی عماری زریں و مرصع اور جھول مخمل زرکار کی ہوتی تھی۔

میانہ۔ میانہ بھی مرصع ہوتا تھا اور اُس پر زردوزی کے کام کے پردے پڑے رہتے تھے۔

سلاطین اسلام کے دستور کے بموجب فرامین شاہی کی پیشانی پر بادشاہ کے نام کا طغرا بنایا اور مہر لگائی جاتی تھی۔ شاہان بہمنیہ نے سونے چاندی کا سکہ بھی بنایا تھا جس کا وزن زیادہ سے زیادہ دو تولہ اور کم سے کم ربع تولہ ہوتا تھا اور اُس کی ایک طرف کلمہ طیبہ اور چاروں خلفار راشدین کے نام اور دوسری طرف بادشاہ کا نام اور تاریخ تیاری سکہ منقش ہوتی تھی یہ سکے سب سے پہلے محمد شاہ اول نے بنائے تھے اور چونکہ ہندوی تعصب نے اُن کے جاری رہنے میں مزاحمت کی اور باوجود مخالفت کے زر اسلام کو

گلا ڈالنے سے باز نہ آئے اس لیئے محمد شاہ نے جوش میں آکر تمام صرافوں کو ایک بار قتل کر ڈالا۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ سلطنت بہمنیہ کے آخر تک برابر زر اسلام رائج رہا مگر جب محمود شاہ بہمنی کے زمانہ میں سلطنت کو زوال ہوا تو صرافوں نے پھر چھ سات برس میں تمام اسلامی سکوں کو گلا ڈالا اور اس کے بعد گو دکن میں پانچ خود مختار حکومتیں قایم ہوئیں مگر کسی نے سونے چاندی کا سکہ جاری نہیں کیا البتہ مسی سکوں کا جاری کرنا پایا جاتا ہی اور اعلیٰ درجہ کے سکوں کے لحاظ سے رایان بیجانگر و تلنگانہ کے محتاج تھے جن کے سکوں کا نام ہن و پرتاب تھا۔ اگرچہ صرافوں نے پوری کوشش کی تھی کہ سلاطین بہمنیہ کے سکوں کو صفحۂ ہستی سے محو کر دیں لیکن ابھی تک اس خاندان کے بعض سلاطین کے سکہ تلاش سے ملک دکن میں مل جاتے ہیں۔

دربار سوائے جمعہ کے ہر روز صبح سے دوپہر تک دربار ہوتا تھا۔ دربار کا کمرہ پر تکلف ریشمی فرشوں سے آراستہ کیا اور اس کے وسط میں مخمل زربفت کا شامیانہ لگایا جاتا تھا جس کے نیچے تخت فیروزہ رکھا جاتا تھا۔ دروازوں پر کمخواب کے پردے پڑے رہتے تھے جس وقت بادشاہ جلوس کرتا تھا تو امراء و عہدہ داران سلطنت اپنے اپنے درجہ کے لحاظ سے دائیں بائیں کھڑے ہو جاتے تھے

سوائے مشائخ و سادات کے کسی شخص کی مجال نہ تھی کہ بیٹھ سکے[1]۔ دروازوں کے پاس اندر کی طرف تورچی اور یساول (چوبدار) کھڑے رہتے تھے۔ جن کا لقب اصطلاح بہمنیہ میں باردار تھا۔ ان کا یہ کام تھا کہ جب کوئی شخص آتا تھا تو اُس کی اطلاع اور خود اُس کو بادشاہ کے حضور میں پیش کرتے تھے اور پردوں کے باہر پردہ دار رہتے تھے جو دربار میں آنے والوں سے ہتھیار لے لیتے تھے اور اُس وقت تک اُن کو روکے رہتے تھے جب تک کہ باردار اطلاع کریں۔ امراء جب حاضر دربار ہوتے تھے تو اُن کے ہمراہی و اردلی قلعہ ارک کے دروازہ کے پاس روک لیئے جاتے تھے۔ دربار میں تمام معاملات سلطنت کا تصفیہ ہوتا تھا۔

دابِ شاہی سلاطین بہمنیہ کے اولاد کی شادی یا تو اپنے ہی خاندان میں ہوتی تھی یا بادشاہان قرب و جوار کے یہاں اور بعض خاص صورتوں میں امراو مشایخین کو بھی بادشاہ کی دامادی کی عزت حاصل ہو جاتی تھی۔

شاہان بہمنیہ نے اُس پالسی کی بھی بنیاد ڈالی تھی جس کو بعد میں سلاطین

---

[1] یہ عزت صرف ملک سیف الدین غوری وزیر سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی کو حاصل تھی لیکن سلطان محمد شاہ کے زمانہ میں اُس نے بھی بادشاہ کی آزادگی کے خیال سے اس طریقہ کو موقوف کر دیا۔ (تاریخ فرشتہ)

مغلیہ کے زمانہ میں بہت ترقی ہوئی۔ یعنی قرب و جوار کے ہندو راجاؤں کی بیٹیوں سے بھی نکاح کرتے تھے۔ سلاطین دہلی کی طرح نکاحی بی بی کو ملکہ جہان اور بادشاہ کی ماں کو ملکۂ مخدومہ جہاں کہتے تھے مگر نکاحی بی بی کے علاوہ حرم سرائے ہر قوم کی عورتوں سے بھری رہتی تھی۔

محل کے اندر خواجہ سراؤں کا پہرا رہتا تھا اور سلطان فیروز شاہ نے یہ قاعدہ بنادیا تھا کہ کسی بیگم کو تین خادمہ سے زیادہ نہ دی جائیں جب نیا بادشاہ تخت نشین ہوتا تھا تو تمام امرا و منصب دار و طرفدار نذر دکھلاتے تھے اور حسب حیثیت پیش کش و ہدایا داخل کرتے تھے۔

سلاطین بہمنیہ میں علم سے عاری کوئی نہ ہوتا تھا بلکہ بعض بہت ہی ذی علم تھے فیروز شاہ کو تو علم کا اس قدر شوق تھا کہ اُس کا اکثر وقت علما کی صحبت اور طالب علموں کو درس دینے میں گزرتا تھا۔ ریاضی میں اُس کو اتنا دخل تھا کہ سنہ ۱۴۰۶ء میں اُس نے بالاگھاٹ دولت آباد میں رصد بندی کا حکم دیا اور اس کام پر حکیم حسن گیلانی۔ اور سید محمود گازرونی کو جو مشاہیر روزگار سے تھے مقرر کیا مگر بعض وجوہ سے جن میں حکیم حسن گیلانی کی بے وقت موت بھی تھی رصد ناتمام رہی۔

فیروز شاہ کے علاوہ محمود شاہ اول اور احمد شاہ اول اور محمد شاہ ثانی بھی بلحاظ ذی علم ہونے کے قابل ذکر ہیں شعرا اور علمار کی اُن کے دربار میں قدر تھی شکار کا شوق بھی اُس زمانہ میں عام تھا اور چونکہ اُس وقت تک بندوق کا رواج نہ تھا اس لیے یا تو تیر یا نیزہ سے شکار کھیلتے تھے یا چیتوں یا شکاری کتوں یا باز و بہری کے ذریعہ سے۔ محمد شاہ ثانی تو شکار کا ایسا متوالا تھا کہ اُس نے خوش ہو کر اپنی ایک بہری کو منصب ہزاری عطا کیا۔ بادشاہ جب کسی سے خوش ہوتا تھا تو اُس کو خلعت دیا جاتا تھا مگر خلعت خاصہ سوائے طرف داران اطراف کے جن کا منصب دو ہزاری ہوتا تھا کسی کو نہ دیا جاتا تھا خلعت خاصہ میں بادشاہ کے لباس کا ایک جوڑا اور کلاہ زردوز اور کمر و شمشیر مرصع اور بعض اوقات اسپ و فیل بھی ہوتے تھے۔ اور جب کوئی شہزادہ ولیعہد مقرر کیا جاتا تھا تو اُس کو کلاہ زردوز و کمر شاہانہ و چتر و سراپردہ سیاہ و فیل و تخت خلعت میں دیئے جاتے بادشاہ کی اردلی میں دو سو منتخب سوار رہتے تھے جن کی تحویل میں شاہی سلح خانہ رہتا تھا اور اس لیئے اُن کو اسلحہ دار کہتے تھے ان کے علاوہ چار ہزار سواروں کا باڈی گارڈ تھا جس میں بڑی تنخواہوں سے منتخب جوان بھرتی کیئے جاتے تھے اور اُن کے گھوڑے اور سلاح اعلیٰ درجہ کے ہوتے تھے

باڈی گارڈ کا نام اصطلاح بہمنیہ میں خاصہ خیل تھا۔

شاہی محل کے پہرہ کے لیئے یہ قاعدہ تھا کہ چار چوکیاں مقرر تھیں اور پچاس سلحدار اور ایک ہزار خاصہ خیل ہر روز صبح سے لیکر دوسرے روز صبح تک پہرہ دیتے تھے اور امراء و منصب دار جو پایہ تخت میں موجود ہوتے تھے وہ بھی خاصہ خیل کے ساتھ پہرہ میں شریک ہوتے تھے۔ ہر چوکی میں جو شخص اعلےٰ درجہ کا ہوتا تھا اُس کو سرنوبت کہتے تھے اور چوکی اول کا سرنوبت دوسرے سرنوبتوں کا بھی افسر سمجھا جاتا تھا جو ایک بہت جلیل القدر منصب تھا۔ بادشاہ جب کسی مہم کا قصد کرتا تھا تو سب سے پہلے دہلیز و سراپردہ سیاہ شہر کے باہر نصب کیا جاتا تھا اور اُسی سے سب لوگوں کو بادشاہ کے ارادہ سے اطلاع ہو جاتی تھی۔ خراج جو ہندو راجاؤں کے پاس سے آیا کرتا تھا اُس میں عموماً نقدی اور ہاتھی گھوڑے اور نفیس سوتی اور ریشمی کپڑے اور خوبصورت تربیت یافتہ لونڈی غلام ہوتے تھے۔

منصب امارت سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی نے ملک کو چار صوبوں میں تقسیم اور اُس کے بیٹے محمد شاہ نے ہر صوبہ کے طرفدار کا لقب اور درجہ مقرر کیا۔ ہر طرفدار کا منصب دو ہزاری ہو۔ اور طرفدار بیجاپور و حسن آباد گلبرگہ جو عموماً دارالسلطنت

بھی ہوتا تھا۔ ملک نائب اور طرفدار دولت آباد مسند عالی اور طرفدار برار مجلس عالی اور طرفدار بیدر و تلنگانہ اعظم ہمایوں کہلاتا تھا طرفداروں کے بعد سپہ سالار کا درجہ تھا جس کا لقب امیر الامراء اور منصب ایک ہزار و پنجصدی ہوتا تھا۔ اور اُس کے بعد وکیل السلطنت کا درجہ تھا جس کا منصب یک ہزار و دُو صدی ہوتا تھا اور باقی امراء کا منصب یکہزاری سے زیادہ اور ایک صدی سے کم نہ ہوتا تھا۔ امراء ہزاری طوق و علم و نقارہ کے مستحق سمجھے جاتے تھے۔ غالباً اس امر کے بتانے کی کوئی ضرورت نہیں ہی کہ یہ تمام خطاب اور مراتب وہی ہیں جو سلاطین دہلی کے یہاں خصوصاً خاندان تغلق کے زمانہ میں مروج[51] تھے۔

خطابات خطابات میں اعلیٰ درجہ کا خطاب خواجہ جہان[52] تھا۔ اُس کے بعد ملک التجار[53] کا درجہ تھا۔ اس کے بعد ملکی کا خطاب تھا مثلاً نظام الملک فخر الملک قوام الملک

---

[51] تاریخ فیروز شاہی شمس سراج عفیف۔ و تاریخ ضیاء برنی۔

[52] یہ خطاب سلطان علاء الدین ثانی نے خواجہ مظفر علی استر آبادی کو دیا تھا۔

[53] سلطان احمد شاہ بہمنی نے اپنی تخت نشینی کے بعد یہ خطاب خلف حسن بصری کے لیے ایجاد کیا تھا جس نے اُس کو تخت سلطنت حاصل کرنے میں اپنی مستعدی اور خوش تدبیری سے بہت امداد دی تھی۔ اور چونکہ یہ شخص سوداگر تھا اس لیئے یہ خطاب اُس کے لیے تجویز کیا گیا۔ مگر بعد میں بلا لحاظ مناسبت کے دیا جانے لگا۔

عماد الملک وعلیٰ ہذا) دولائی اور جنگی کے خطابات اُس زمانہ میں مروج نہ تھے اخیر درجہ کا خطاب خانی کا تھا لیکن اس میں سب سے بڑا خطاب خانخانان کا سمجھا جاتا تھا۔ اور اُس کے بعد خانجہان اور خان زمان وغیرہ کا درجہ تھا۔ یہ خطابات بھی سلاطین دہلی کی تتبع سے اختیار کیے گئے تھے صرف ملک التجار کا خطاب نیا تھا

عہدہ ہائے سلطنت | اعلیٰ درجے کے عہدے حسب ذیل تھے:-

(۱) وکیل السلطنت

(۲) وزیر کل

(۳) امیر جملہ

(۴) اشراف

(۵) نظارت

(۶) پیشوا

(۷) کوتوال دار السلطنت

(۸) صدر جہاں

اس وقت یہ معلوم ہونا کہ ان عہدوں سے کیا کام متعلق تھے دشوار ہے اور کسی تاریخ میں اس کی تفصیل نہیں مل سکتی لیکن اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ وکیل سلطنت

کا عہدہ سول عہدوں میں برترین تھا اور وہ زیادہ تر بطور وزیر صیغۂ خارجہ کے ہوتا تھا اور بادشاہ کی غیرحاضری میں کاروبار سلطنت کو انجام دیتا تھا۔ جب کوئی شخص اس عہدہ پر مقرر ہوتا تھا تو اُس کو ایک انگشتری بطور علامت عہدہ کے دی جاتی تھی۔ وزیر کل تمام انتظام اندرونی کا ذمہ دار تھا۔ اور امیر جملہ بطور لارڈ چیمبرلین (میر اخور) کے ہوتا تھا۔ کوتوال شہر نہ صرف افسر پولیس ہوتا تھا بلکہ معمولی مجرموں کو بحیثیت مجسٹریٹ سزا بھی دیتا اور مہتمم مجالس بھی ہوتا تھا۔ صدر جہاں قاضی القضاۃ کا لقب اور وہ گویا بطور چیف جسٹس کے ہوتا تھا۔ باقی عہدوں کی کچھ کیفیت معلوم نہیں ہوسکی مگر یہ لازم نہ تھا کہ ہر عہدہ پر علیحدہ شخص مقرر کیا جائے بلکہ اکثر اوقات متعدد عہدے ایک ہی شخص کو دیئے جاتے تھے۔

دار السلطنت سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی نے گلبرگہ کو دار السلطنت بناکر حسن آباد نام رکھا تھا جہاں ابھی تک ایک قدیم مسجد جس کا طرز عمارت اپنی آپ ہی نظیر ہے اور حضرت شاہ سید محمد گیسو دراز کا خوبصورت گنبد سلطنت بہمنیہ کی شان و شوکت پر شہادت دے رہا ہے مگر بعد میں احمد شاہ ولی بہمنی نے خوشگواری آب و ہوا کی وجہ سے بیدر میں جو ایک بہت قدیم شہر ہے منتقل کرکے اس کا نام

احمد آباد[۵] رکھا۔ شہر کے گرد فصیل اور اُس کے اندر وسیع بازار بنائے گئے اور وسط شہر میں قلعۂ ارک پتھر اور چونے سے تعمیر کیا گیا جس میں متعدد شاہی محل تھے۔ اور ہر محل کا خاص نام ہوتا تھا چنانچہ ایک محل کا نام نگینہ محل تھا۔ شہر کے باہر کثرت سے باغات تھے جن میں پُر تکلف مکانات بنے ہوئے تھے۔ ایک باغ کا نام جو سلطان علاء الدین نے لگایا تھا نعمت آباد تھا۔

اشاعت علم سلاطین بہمنیہ کو اشاعت علم کی طرف بہت توجہ تھی تمام شہروں اور قصبوں اور بڑے بڑے موضعوں میں مسجدیں تھیں اور ہر مسجد کے متعلق ایک مدرسہ تھا جس میں عربی و فارسی کی تعلیم ہوتی تھی ان مدرسوں کا خرچ اوقاف سے چلتا تھا جو مسجدوں سے متعلق ہوتے تھے اور آبادی کے خیال سے ہر مسجد میں امام و موذن و فراش مقرر تھے۔ محمود شاہ بہمنی (المتوفی ۱۳۹۷ء) نے ایک سخت قحط کے بعد یتیموں کے لیئے گلبرگہ۔ بیدر۔ قندھار۔ ایلچپور۔ دولت آباد۔ جنیر۔ جیول۔ دابل وغیرہ میں یتیم خانہ قایم اور یتیموں کی تعلیم و تدریس کے لیئے معلم مقرر کیئے۔ سلاطین بہمنیہ نے رعایا کی تعلیم کا ایسا اچھا انتظام کیا تھا کہ اُس کا

---

[۵] بیدر کا نام اورنگ زیب کے زمانہ تک احمد آباد رہا مگر اُس نے اُس کو بدلکر محمد آباد کر دیا اور اس لیئے ابھی تک محمد آباد بیدر مشہور ہے۔ (از اخبار الاخیار)

اثر ابھی تک اُن کے ممالک محروسہ کے حدود سے محو نہیں ہوا۔

تعمیرات عامہ

سلاطین بہمنیہ نے کبھی تعمیرات عامہ کی طرف مثل دوسرے سلاطین اسلام کے توجہ نہ کی صرف سلطان علاء الدین ثانی نے ایک دارالشفا بیدر میں تعمیر کی تھی جہاں مریضوں کو مفت دوا ملتی تھی اور بے استطاعت لوگوں کے رہنے کا بھی بندوبست تھا اور اُن کو کھانا کپڑا سرکار کی طرف سے ملتا تھا۔ سوائے اس ایک دارالشفا اور چند مقبروں اور مسجدوں کے اور کوئی عام فائدہ کی عمارت مثل سرائے وچاہ اور مدارس وسڑک تعمیر نہیں ہوئی اور نہ کسی نے آب رسانی کا کارخانہ قایم کیا اور نہ ڈاک کی چوکیاں بنائیں۔ سلاطین بہمنیہ کی یادگاریں فقط مستحکم پہاڑی قلعے ہیں جو آج بھی گرم وسرد زمانہ کا ویسے ہی استقلال سے مقابلہ کر رہے ہیں جیسا کہ پانسو برس پیشتر اپنی تعمیر کے وقت کرتے تھے[1]۔

انتظام پولیس و عدالت

حفظ امن و انسداد جرایم کے خیال سے ہر شہر اور گاؤں میں پولیس اور قضایا کے انفصال کے لیئے ایک ایک قاضی یا میر عدل مقرر تھا۔

ہنود کی حالت

سلاطین بہمنیہ کے زمانہ میں ہنود کی حالت بہت اچھی تھی مسلمان حکومتوں کا خاصہ ہے کہ وہ کبھی مفتوحین کے رسم و رواج کے بجائے اپنے رسم ورواج

---

[1] کرنل میڈوز ٹیلر۔ آرکی ٹیکچر آف بیجاپور۔

کو قایم نہیں کریں اور اسی لحاظ سے سلاطین بہمنیہ نے جو عہدے قدیم سے چلے آتے تھے اُن کو موقوف نہیں کیا بلکہ خود اپنی طرف سے قایم کرکے مستحکم کیا۔ سلطان علاءالدین حسن بہمنی کی شکرگذاری نے نہ صرف اپنے قدیم سرپرست برہمن کے نام کو اپنے نام کا جزو اور اُس کی ذات کو اپنے خاندان کا لقب قرار دیا تھا بلکہ گنگو کو ہی سردفتر حساب مقرر کیا۔ یہی وہ پہلا برہمن ہو جس نے اسلامی بادشاہوں کی ملازمت اختیار کی لیکن اُس نے کسی ایسی ساعت سعید میں اپنی خدمت کا جائزہ لیا تھا کہ ابھی تک اُس کے ہم قوم شاہان دکن کے حسابات پر حاوی ہیں ہندوؤں پر کوئی خاص ٹکس نہیں تھا اور نہ وہ ممنوع الملازمت تھے۔ اُن کو فوج میں بھی عہدے دیئے جاتے تھے۔ گو کہ اس میں عام اسلامی پالیسی کے لحاظ سے جس کی ضرورت کو ہندو سلطنوں کے قرب نے اور بھی مستحکم کردیا تھا کسی قدر احتیاط کی جاتی تھی۔

رحمدلی پالسی سلطان محمد شاہ اول نے کشن رائے والی بیجانگر سے معاہدہ کیا تھا کہ فقرا و مساکین و عورات و اطفال جنگ کے وقت قتل سے محفوظ رہیں اور جو شخص زندہ گرفتار ہو اُس کو کسی قسم کا آزار نہ پہونچایا جائے۔ یہ خوشی کی بات ہی کہ سوائے سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے (اور اُس نے بھی محض تنگ آکر) اور

کبھی کسی نے اس معاہدہ کی خلاف ورزی کرکے اپنے دامن کو آلودہ نہیں کیا یہ ایسی مقبول اور رحمدل پالسی ہو کہ گو اس کی ضرورت کو اس وقت سب لوگ تسلیم کرتے ہیں مگر اُس کی پوری پابندی کسی مہذب سے مہذب سلطنت سے بھی نہیں ہو سکتی۔

فوج سلاطین بہمنیہ کی فوج کی تعداد کبھی کسی زمانہ میں پچاس ہزار سوار سے زیادہ نہیں ہوئی اور ان کے علاوہ ہر لشکر کے ساتھ متعدد ہاتھی اور توپ خانے ہوتے تھے معلوم ہوتا ہو کہ ہنود بیجانگر کے یہاں توپخانے کا سب سے پہلے رواج ہوا مگر ۱۳۶۶ء میں محمد شاہ اول نے بیجانگر پر چڑھائی کی اور ایک کامیاب لڑائی[1] میں کئی توپیں اُس کے ہاتھ آگئیں جس کے بعد اُس نے توپیں اور باروت بنانے کے کارخانے قایم کیے۔ توپچی کی خدمت پر عموماً رومی و فرنگی رکھے جاتے تھے اور حفاظت کی غرض سے رات کے وقت توپوں کو زنجیروں میں جکڑ دیا کرتے تھے۔ بندوقیں ابھی تک ایجاد نہ ہوئی تھیں۔ اس لیے معمولی لڑائیوں میں

---

[1] سر ہنری ایلیٹ نے لکھا ہو کہ اتنے قدیم زمانہ میں ہندوستان میں توپوں کا استعمال ہونا قرین قیاس نہیں ہو لیکن جس تاریخی شہادت پر کہ یہ واقعہ مبنی ہو وہ نہایت قوی ہو اور جبکہ یہ مسلم ہو کہ ۱۳۱۳ء میں یورپ میں توپوں کا رواج ہو گیا تھا تو ہندوستان میں ۱۳۶۶ء یا اُس کے قریب میں توپوں کا مروج ہونا خلاف قیاس نہیں ہو سکتا۔

توپیں زیادہ کام نہ آتی تھیں صرف محاصروں میں اپنی زہرہ شگاف آواز سُنا کر قلعہ کی دیواروں کو خاک میں ملاتی تھیں۔ توپوں کے ساتھ منجنیقوں (گوپھنوں) سے بھی قدیم طریقے کے بموجب محاصروں میں کام لیا جاتا تھا۔ خواجہ جہاں کی وفات کے تھوڑے عرصہ بعد ایک پرتگیزی سیاح[۵۱] ڈوارٹ باربوسا نامی نے دکن کا سفر کیا تھا اُس نے اپنے سفرنامہ میں دکن کی فوج کے بہت دلچسپ حالات لکھے ہیں وہ تحریر کرتا ہے کہ "فوج میں سواروں کی کثرت تھی جو عموماً ایران و ترکستان وغیرہ کے رہنے والے تھے وہ چھوٹی چھوٹی کاٹھیوں پر سوار ہوتے تھے اور اُن کا لباس سوتی کپڑے کا ہوتا تھا اور سروں پر مختصر ٹوپیاں اوڑھتے تھے بعض روئی دار کمریاں پہنتے تھے اور بعض زرہ کا بھی استعمال کرتے تھے اور گھوڑوں کو تاروں کی جھولوں سے مسلح کرتے تھے اُن کی گردنوں میں ترکی کمانیں ہاتھوں میں لمبے لمبے سبک نیزے جن کی چوپھلی انی تین ہاتھ لمبی ہوتی تھی اور کمر میں ترکش لگے رہتے تھے۔ تیراندازی میں عموماً سب کو اچھی مشق ہوتی تھی۔ ان ہتیاروں کے علاوہ بعض کے پاس کٹارا اور تبر اور دو تلواریں پرتلے میں گویا کہ ہر سوار کے پاس دو سپاہیوں کے ہتیار رہتے تھے۔ زمانۂ سفر میں سامان رسد کو بیلوں پر

---

[۵۱] اسٹنلی کا سفرنامہ باربوسا۔

لاد کے لیجاتے تھے اور سرداروں کے آرام و آسایش کی غرض سے سوتی خیمے ساتھ رہتے تھے توپوں کا رواج اچھی طرح ہوگیا تھا۔ اور اکثر ترک توپچی کی خدمت پر مقرر کیئے جاتے تھے۔ بیجانگر کی فوج میں اکثر فوج تو پیدلوں کی ہوتی تھی اور معدودے چند سوار ہوتے تھے۔ پیدل فوج میں سے ہر شخص کے پاس ڈھال تلوار اور کمان و ترکش ہوتے تھے اور اُن کو تیراندازی میں اچھی مشق ہوتی تھی یہ لوگ دھوتی باندھتے تھے اور اوپر کے جسم پر کوئی کپڑا نہ پہنتے تھے۔ سروں پر مختصر ٹوپیاں ہوتی تھیں"[1] مگر جب کہ ایسی فوج رکھنے کا ہمیشہ یہ نتیجہ ہوا کہ اہالی بیجانگر کو شکستیں ہوئیں تو دیورائے راجہ بیجانگر نے جو بہت اولوالعزم تھا سلطان علاء الدین ثانی کے زمانہ میں فوج میں بہت سی اصلاحیں کیں اُس نے سواروں کی تعداد کو اٹھارہ ہزار سے ستر ہزار کر دیا۔ اور کثرت سے مسلمان فوج میں بھرتی کیئے گئے اور اُن کی دلدہی کے لیئے ایک مسجد بیجانگر میں تعمیر کر دی اور ہر روز صبح کے وقت جب دربار میں بیٹھتا تھا تو رحل پر کلام اللہ اپنے سامنے رکھ لیتا تاکہ مسلمان اُسے دیکھ کر سر جھکائیں۔ اس کے علاوہ اُس نے سپاہیوں کی تنخواہیں بھی اضافہ کیا اور تیراندازی کی مشق کی طرف بھی توجہ کی۔

---

[1] تاریخ فرشتہ۔

سوسائٹی اس زمانہ[۵] میں یا اس سے تھوڑے زمانہ بعد جن سیاحوں نے دکن کی سیر کی تھی ان کی سفرناموں سے معلوم ہوتا ہو کہ سوسایٹی پچمیل تھی سب سے بڑا گروہ دکن کے اصلی باشندوں ہنود کا تھا۔ اس کے بعد دکنی مسلمانوں کا گروہ تھا جو عموماً ترکوں۔ عربوں۔ ایرانیوں اور حبشیوں کی نسل سے تھے مگر اس گروہ میں نومسلم بھی اپنے آپ کو شمار کرتے تھے۔ ان کے بعد تازہ ولایت عربوں ایرانیوں ترکوں اور حبشیوں کا درجہ تھا جو عموماً اس ملک کو اپنا وطن بنا کر یہیں شادی بیاہ کر لیتے تھے ہر شخص زیادہ تر اپنے ہی رسم و رواج کا پابند تھا لیکن باہمی میل جول کی وجہ سے مسلمانوں کے رسم و رواج پر بھی ہندوؤں کا اثر نمودار ہو چلا تھا۔ شہروں میں مکانات عموماً پختہ ہوتے تھے اور صاحب مقدرت پتھروں کے مکانات میں بھی رہتے تھے تمام شہروں میں مسافروں کے لیئے سرائیں ہوتی تھیں اور بازار وسیع اور دوکانوں میں ہر قسم کے اجناس فروخت کے لیئے موجود رہتی تھیں۔ علم کا عام طور پر رواج اور عالموں کی قدر تھی۔ لباس اکثر لوگ رنگ برنگ کے ریشمی کپڑوں کا پہنتے تھے اور شراب کا رواج عموماً طبقۂ امرا و سلاطین میں تھا۔ موروثی امرا کا کوئی

---

[۵] اسٹینلی کی کتاب ۱۔ بوسا گرہ وا انجز۔ تاریخ فرشتہ۔ ماثر برہانی۔

طبقہ نہ تھا۔ ہر امیر کا خطاب ذاتی اور جاگیر مشروط بالجمعیت ہوتی تھی اور سامان امارت مثل میانہ و فیل و اسپ بادشاہ کی ملک سمجھا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے ادنیٰ درجہ کا آدمی اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبہ پر جوہر ذاتی سے پہونچ سکتا تھا۔ غلامی کوئی عیب نہ تھی بلکہ بندگی خداوندی کا زینہ سمجھی جاتی تھی۔ تجارت کو بھی لوگ حقارت کی نظر سے نہ دیکھتے تھے بلکہ ایک شریف پیشہ سمجھتے تھے۔

اصلاحات انتظامی خواجہ جہان محمود گاوان کی جنگی زندگی اور سلطنت بہمنیہ کی عام حالت دکھانے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہی کہ اُن اصلاحوں کی طرف توجہ کی جائے جو اُس نے انتظام مملکت میں کیں۔ سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی جب سنہ ۱۳۵۸ء میں فوت ہوا تو خاندان بہمنیہ کے قبضہ میں اس وقت ملک مہاراشٹر اور صوبہ تلنگانہ کا کسی قدر حصہ اور اضلاع رایچور و مدگل کرناٹک میں تھے۔ جب محمد شاہ بہمنی اپنے باپ کی جگہ تخت شاہی پر جلوہ گر ہوا تو اُس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ملک کو چار صوبوں میں جن کا نام اُس نے اطراف رکھا تقسیم کیا اور ہر صوبہ میں ایک طرفدار مقرر کیا۔ ایک سو بیس برس کے عرصہ میں راجایان بیجانگر و تلنگانہ و کانکن و اوڑیسہ کے ممالک کا اکثر حصہ فتح ہوا اور سوائے بیجانگر کے کوئی مخالف حکومت قرب و جوار میں

باقی نہ رہی اس لیئے ملک کی حدود بہت وسیع ہوگئیں مگر باوجود اس کے قدیمی تقسیم قایم رہی جس میں وہ تمام نقص نمودار ہو گئے جو کسی ایسے طریقہ میں پائے جاتے ہیں جس کی نظر ثانی باوجود حالات کے بدل جانے کے نہ کی گئی ہو اور ہر صوبہ کا طرفدار اس قدر قوی ہو گیا کہ اُس کو حد اعتدال میں رکھنا دشوار تھا۔ آخرکار خواجہ جہان محمود گاوان نے ۱۴۸۰ع میں خیال کیا کہ اصول سیاست کے بموجب حکومت کو اس طرح تقسیم کرنا چاہیے کہ کسی ایک شخص کے ہاتھ میں زیادہ قوت جمع نہ ہو اور بادشاہ کا قابو سب پر یکساں رہے اس لیئے اُس نے تمام ملک کو بجائے چار اطراف کے آٹھ صوبوں میں تقسیم کیا جس کی تفصیل یہ ہے۔

تقسیم قدیم	تقسیم جدید
(۱) گلبرگہ	(۱) بیجاپور۔ جس میں رایچور و مدگل اور بہت سے اضلاع دریائے ہون تک شریک کیئے گئے۔
	(۲) حسن آباد جس میں اضلاع گلبرگہ و نلدرگ

تقسیم قدیم	تقسیم جدید
	اور شولاپور شامل ہوئے۔
(۲) دولت آباد	(۳) دولت آباد
	(۴) جنیر۔ اس میں کانکن و گوا و بلگاؤں بھی شریک تھے۔
(۳) تلنگانہ	(۵) راجمندری جس میں اضلاع نلگنڈہ و ہداوریا شریک تھے۔
(۴) برار	(۶) ورنگل۔
	(۷) گاویل۔
	(۸) ماہور۔

اور اس غرض سے کہ بادشاہ کا رعب وداب تمام صوبوں پر قایم رہے اور حالات معلوم ہوتے رہیں اُس نے ہر ایک صوبہ سے بعض بعض دیہات کو بادشاہ کے اخراجات کے لیئے خاص کیا جس سے تمام ملک پر شاہی نگرانی قایم ہو گئی۔

سلطان علاءالدین حسن گنگو بہمنی کے وقت سے ایک یہ بات بھی چلی آتی تھی کہ جس سمت میں جتنے قلعے ہوتے تھے وہ اُسی سمت کے طرفدار کی تحت میں رہتے

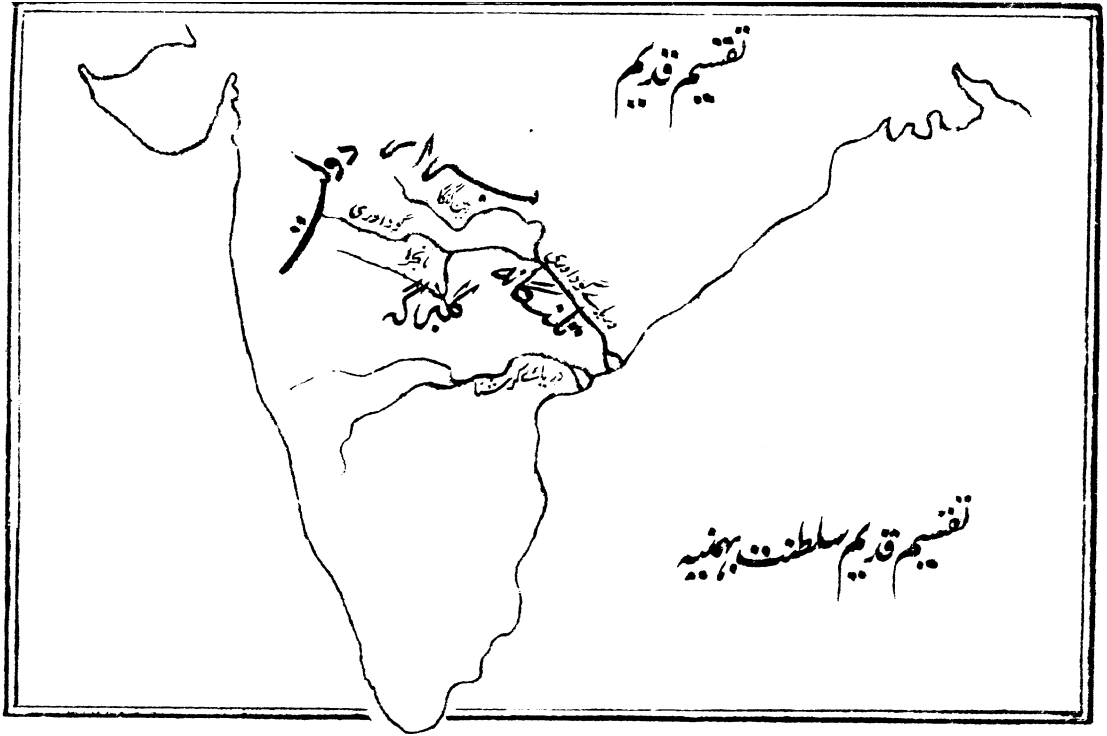
تقسیم قدیم سلطنت بهمنیه

تقسیم قدیم
دولت
برار
پن گنگا
گوداوری
مانجرا
گلبرگه
تلنگانه
دریائے گوداوری
دریائے کرشنا

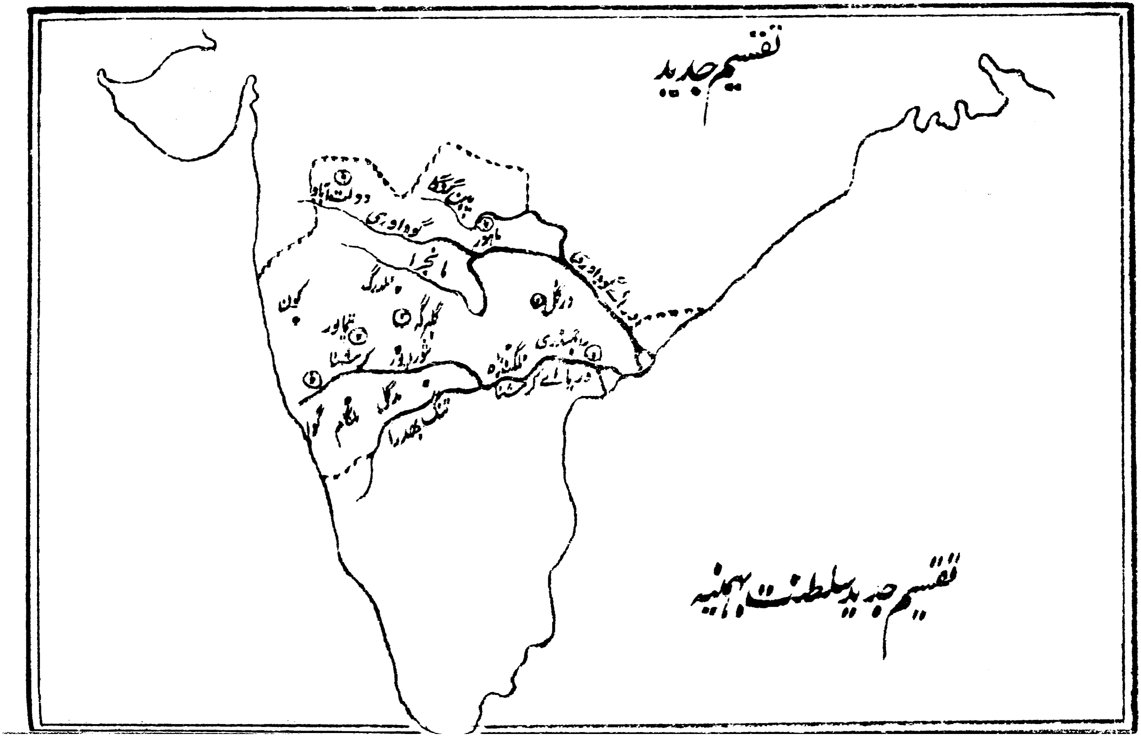
تقسیم جدید
دولت آباد
پین گنگه
ماهور
گوداوری
مانجرا
نلدرگ
کیون
گلبرگه
بیجاپور
شولاپور
کرشنا
ورنگل
راجمندری
گلکنده
دریای کرشنا
دریای گوداوری
مدگل
بلگام
گوه
تنگبهدرا
تقسیم جدید سلطنت بهمنیه

اور وہ جس کو چاہتا تھا اپنی طرف سے قلعدار مقرر کر دیتا تھا اس کا یہ نتیجہ تھا کہ طرفداروں کی قوت بیحد بڑھ جاتی تھی اور جب جی میں آتا تھا سرکشی کر بیٹھتے تھے خواجہ جہاں نے اس طریقے کو بھی موقوف کیا اور قرار دیا کہ صرف ایک قلعہ سرلشکر سمت کی تحت میں رہے باقی قلعوں پر بادشاہ کی طرف سے امراء و منصب دار قلعدار مقرر ہوا کریں اور اُن کو اور اُن کی فوج کو شاہی خزانے سے تنخواہ ملا کرے۔ ان لوگوں کے تقرر سے نہ صرف طرفداروں کی قوت میں کمی ہوئی بلکہ یہ لوگ اُن کے افعال کے نگراں بھی رہتے تھے۔ انتظام مالگزاری کے متعلق یہ بندوبست کیا کہ مالکان اراضی کی حقیت کو مشخص کر کے رجسٹروں میں درج کیا اور دیہات و تعلقات و اسامات کی جمعبندی کو احاطۂ تحریر میں لا کر ایسا سیدھا سادا طریقہ جاری کیا کہ جس سے رقم وصول شدہ کی بھی آسانی سے تنقیح ہو سکے اور رعایا بھی استحصال بیجا سے محفوظ رہے۔ تاریخ ہندوستان میں بندوبست مالگزاری کی یہ پہلی مثال ہی اور خواجہ جہاں محمود گاواں کو یہ فضیلت حاصل ہی کہ اُس نے سب سے پہلے ایک ایسے ضروری انتظام کی طرف توجہ کی جس کا اثر ہندوستان کی ۹۰ فی صدی مخلوق کی آرام و آسایش پر پڑتا ہی اور جس کو آج تک انتظام سلطنت کا سب سے بڑا جزو سمجھا جاتا ہی۔ اس کے علاوہ

تمام دیہات کی حد بندی بھی کی یہ سب ایسے عمدہ انتظامات تھے کہ اُن کا اثر رعایا پر تو اچھا پڑا مگر طبقۂ امراء میں عام ناراضی پھیل گئی۔

انتظام فوج خواجہ جہان محمود گاوان نے انتظام فوج کی طرف بھی پوری توجہ کی کیونکہ اس کی اصلاح کی اُس پُر آشوب زمانہ میں جبکہ قوی دشمن سلطنت بہمنیہ کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھے بہت ضرورت تھی۔ سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی کے وقت سے یہ طریقہ چلا آتا تھا کہ افواج کے کمانڈروں کے دو درجے تھے ایک تو پانصدی۔ دوسرا ہزاری۔ سرلشکران پانصدی کو ایک لاکھ ہُن(۱) سالانہ ملتے تھے اور امرائے ہزاری کو دو لاکھ ہُن۔ اور یہ روپیہ یا تو نقد دیا جاتا تھا یا اُس کے معاوضے میں جاگیر دی جاتی تھی۔ چونکہ سپاہی کی کوئی تنخواہ مقرر نہ تھی اور گنتی کا بھی کوئی قاعدہ یا ضابطہ نہ تھا اس لیئے سرلشکر نہ تو ٹھیک تعداد میں فوج رکھتے تھے اور نہ سپاہیوں کو معقول تنخواہ دیتے تھے کہ وہ دل سے سرکاری خدمتیں بجا لاتے۔ خواجہ جہان نے سپاہی سے لیکر امرائے ہزاری تک کی تنخواہ مقرر کر دی اور زمانہ کی حالت کے لحاظ سے اُس میں معتد بہ اضافہ کیا اور قرار دیا کہ امرائے پانصدی کو ایک لاکھ پچیس ہزار ہُن

---

(۱) ایک ہن ساڑھے تین روپیہ کلدار کے برابر ہوتا ہے۔

اور ایک ہزاری کو دو لاکھ پچاس ہزار ہُن ملا کریں۔ مگر اُس کے ساتھ ہی حاضری کا ایسا طریقہ مقرر کیا کہ اگر ایک سپاہی بھی تعداد مقررہ سے کم رکھا جاتا تو لشکر کی تنخواہ سے اسی قدر رقم وضع ہو جاتی تھی جو ایک بہت ضروری اصلاح تھی اس کے علاوہ محمود گاوان فوج کے خوش رکھنے کی اور بھی تدبیریں کرتا رہتا تھا اُس کو سپاہی کے دل لبھانے کے ایسے ڈھنگ یاد تھے کہ اُس کا وار کبھی خالی نہ جاتا تھا۔ جب سنہ ۱۴۷۳ء میں دکن میں دو سالہ قحط پڑا جس سے تمام ملک ویران ہو گیا اور اُس کے بعد راجہ اوڑیسہ نے موقع پاکر بہت سی فوج کے ساتھ یورش کی تو شاہی فوج کو بددل و ہراساں دیکھ کر خواجہ جہاں نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ ایک سال کی تنخواہ تقسیم کر دی جائے جس سے سب لوگ اس قدر خوش ہوئے کہ خوب جی توڑ توڑ کر لڑے۔

آفاقی و دکنی

خواجہ جہاں ایک نہایت دانشمند آدمی تھا چونکہ ملک التجار خلف حسن بصری کا واقعہ اُس کے آنے سے چند ہی روز پیشتر ہوا تھا اس لیے اُس نے اُس کے دل پر ایسا اثر نہ کیا تھا کہ کبھی محو ہو سکتا۔ اُس نے کوشش کی کہ دونوں فرقوں میں اختیارات کی میزان کے پلڑوں کو برابر رکھے اور جو شخص بادشاہ کی خیر خواہی اور جوہر ذاتی کا ثبوت دے اُس کی قدر و منزلت

بلا لحاظ اس کے کہ وہ دکنی ہو یا حبشی یا آفاقی کی جائے۔ محمد شاہ کی حکومت کے اوائل میں امرا نے بہت سر اٹھایا تھا اس لیے رفتہ رفتہ اُن کو ختم کیا گیا اور اُن کے بجائے غلاموں کی تعداد کے بڑھانے کی طرف توجہ کی گئی۔ چار ہزار غلام باڈی گارڈ میں داخل کیے گئے جن میں سے دو ہزار حبشی و دکنی اور دو ہزار گرجی و چرکس و قلماق وغیرہ تھے۔ خواجہ جہاں دونوں گروہوں کو ایک نظر سے دیکھتا تھا۔ چنانچہ جب محمد شاہ نے رائے اوریا پر چڑھائی کرنے کا خیال کیا تو اُس نے بادشاہ کو صلاح دی کہ یہ کام ملک حسن بصری کے جو ایک نومسلم برہمن غلام تھا سپرد کیا جائے۔ بادشاہ نے اُس کو نظام الملک کا خطاب دے کر اس کام پر متعین کیا اور جب وہ فتح و نصرت کے ساتھ اس مہم سے واپس آیا تو اُس کو سر لشکر تلنگانہ مقرر کرا کے خلعت خاص دلوایا۔ انتظام جدید کے وقت بھی اس اصول کو بخوبی پیش نظر رکھا چنانچہ نظام الملک بحری کو طرفدار راجمندری اور فتح اللہ عماد الملک بانی خاندان عماد شاہیہ کو طرفدار گاویل مقرر کیا اسی طرح آفاقیوں میں سے خواجہ جہاں نے یوسف عادل خاں کو جو اس کا غلام تھا غلامی کے درجے سے سر لشکری دولت آباد کے درجہ تک پہونچایا اور فخر الملک گیلانی کا طرفداری جنیر پر تقرر کیا خاندان شاہی میں سے اعظم خاں پسر

سکندر خاں کو ونگل کا طرفدار مقرر کیا اور حبشیوں میں سے دستور دینار اور خداوند خاں کو سرلشکر حسن آباد وماہور کی عزت بخشی۔ خواجہ جہاں کے ذاتی ملازموں میں ملک اشرف و ملک وحید دکنی بہت بڑا درجہ رکھتے تھے اور فخر الملک دکنی جس کو اُس کے بعد خواجہ جہاں کا خطاب ملا اُس کا غلام زادہ تھا۔ غرض کہ خواجہ جہاں تمام گروہوں کی پوری پوری حفاظت کرتا تھا اور جس شخص کو لایق پاتا تھا خواہ وہ غلام ہو کہ امیر دکنی ہو کہ آفاقی اُس کی قدر کرکے اُس کو ایسے اعلےٰ مرتبہ پر پہونچاتا تھا کہ جس کے وہ لایق ہوتا تھا اِسی وجہ سے کسی شخص کو اُس کی بجا شکایت کا بہت کم موقع ملتا تھا۔ اہل ملک کا سچا ہمدرد تھا اور اس کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہی کہ اُس نے دارالسلطنت میں ایک عالی شان مدرسہ قایم کرکے ایسا سرچشمہ جاری کردیا جو تمام ملک کو علم کی برکت سے سیراب کرکے اہل ملک کو اپنے ملک کے انتظام کے قابل بنا دے

اسلامی ڈپلومیسی

خواجہ جہاں محمود گاوان نہایت دور اندیش مُدبّر تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ سلطنت کو اُسی وقت فروغ ہو سکتا ہی جبکہ دوسری سلطنتوں سے ربط و اتحاد ہو چنانچہ اُس نے جیسے دوستانہ تعلقات کہ محمود شاہ والی گجرات کے ساتھ قایم کیے تھے اُن کی کیفیت پہلے ہی لکھی جاچکی ہی اور یہ بھی بتایا گیا ہی

کہ یہ دوستی قیام سلطنت دکن کے بارہ میں کس قدر مفید ثابت ہوئی خواجہ جہان تمام دُنیا کے مسلمانوں کو ایک سمجھتا اور اُس کا منصوبہ یہ تھا کہ تمام اسلامی سلطنتوں میں آپس میں دوستانہ تعلقات رہیں اور ایک کو دوسری کے ساتھ جیسا کہ اخوت اسلامی کا تقاضا ہے ہمدردی ہو۔ یہ وہ مبارک پالیسی تھی کہ اگر کاش سب لوگوں کا ایسا ہی خیال ہوتا جیسا کہ یقیناً ہونا چاہیئے تو آج اسلام کی پردۂ دُنیا پر ایسی بے توقیری ہرگز نہ ہوتی جیسی کہ ہے اور اسلامی سلطنتیں بجائے اس کے کہ ایک دوسرے کے زوال کا باعث ہوں ترقی کا سبب ہوتیں اس پالیسی کا یہ نتیجہ ہوا کہ قرب و جوار کی سلطنتیں شاہ دکن کو حامی دین سمجھنے لگیں جب سلطان الشرق محمود شاہ جون پوری پر بُرا وقت پڑا تو اُس نے محمد شاہ کے پاس طلب مدد کے لیئے ایلچی بھیجے اور گو محمد شاہ بعض مصلحتوں کی وجہ سے مدد نہ دے سکا لیکن سلطنت دکن و جون پور میں دوستانہ تعلقات قایم ہوگئے اسی طرح خواجہ محمد شاہ کی طرف سے سلطان مراد والی ترکی اور سلطان مصر اور شاہ گیلان وغیرہ کو تحفہ تحایف بھیجتا اور اُن سے خط و کتابت کرتا رہتا تھا۔

جب خواجۂ جہان کو کوکن میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی تو اُس نے سلطنت دکن کی عظمت قایم کرنے کے لیئے اپنی فتوحات کی تفصیلی حالات قریب قریب

تمام دُنیا کے شاہان اسلام کو لکھے۔

خواجہ جہان محمود گاوان کی پرائیویٹ لایف

اگر خواجہ جہان محمود گاوان کی پرائیویٹ لائف کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہی کہ ایک صاف شفاف سیمیں چشمہ ہی کہ نہایت خاموشی سے بہہ رہا ہی اور خود تو زور و شور سے پاک ہی مگر جس طرف اُس کا گزر ہوتا ہی اُس کے کناروں پر ہری ہری کھیتیاں موجود ہو جاتی اور خوشنما پھول اُس کے شفاف پانی میں اپنی دلربا تصویر دیکھ کر جوش مسرت سے ہلتے ہیں۔ خواجہ جہان جس وقت کرسی وزارت پر جلوہ افروز ہوتا تھا تو ایک ذیجاہ امیر معلوم ہوتا اور اُس کی اردلی میں چار ہزار سوار رہتے جن میں دو ہزار ترک تو خود اُس کے نوکر اور دو ہزار بادشاہ کی طرف سے مقرر تھے لیکن جب اپنے مکان پر جاتا تو اوس کی حالت بدل جاتی تھی اُس نے تمام عمر اپنی تنخواہ سے ایک پیسہ اپنی ذات پر خرچ نہیں کیا اور گو ایسے جاہ و مرتبہ پر پہونچ گیا تھا لیکن اُس نے اپنے شریف پیشہ تجارت کو ترک نہیں کیا بلکہ اُسی کو کسب معاش کا ذریعہ سمجھتا رہا۔ ایران سے جب ہندوستان آیا ہی تو اُس کے پاس چالیس ہزار لاری[1] تھے اور

---

[1] ایک لاری ۵ کلدار کے برابر ہوتا ہی۔

اسی راس المال سے اُس نے اپنے کاروبار و تجارت کو مرتے دم تک قایم رکھا تجارت سے جو نفع ہوتا تھا اُس میں سے ہر روز بارہ لاری اپنے خرچ کے لیے نکال لیتا تھا اور جو باقی رہتا تھا اُس میں سے کچھ تو اپنی ماں اور عزیزوں کو اور کچھ مختلف ممالک کے زاہدوں اور عالموں اور واجب الرعایت لوگوں کو بھیجا کرتا تھا جن سے اثنائے سفر میں ملاقات ہوتی تھی۔ خواجہ جہاں کے اس خزانہ کا نام "خزانۂ درویشان" تھا اور اس کے سوا ایک دوسرا خزانہ تھا جس کا نام "خزانہ شاہ" تھا اُس کی یہ کیفیت تھی کہ جو کچھ جاگیر سے وصول ہوتا تھا اور یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ اُس کی جاگیر میں تیس ہزار گاؤں تھے[ل] اُس میں سے گھوڑے ہاتھیوں اور سرکاری باورچیخانہ کا ایک مہینہ کا خرچ نکال لیتا تھا اور باقی کو "خزانہ شاہ" میں جمع کرکے اُس کو بھی فقرا و مساکین میں تقسیم کر دیتا تھا اپنے خرچ کے لیے ایک کوڑی بھی نہ رکھتا تھا اگرچہ مطبخ سرکاری میں عمدہ عمدہ کھانے پکتے تھے مگر وہ اُن کو چکھتا بھی نہ تھا۔ اُس کے لیے صرف ایک قسم کا کھانا پکتا تھا اور وہ بھی مٹی کی ہانڈی میں۔ آرام و آسایش کی یہ کیفیت تھی کہ پلنگ پر بھی نہ سوتا تھا بلکہ زمین پر

[ل] ماثر برہانی

چٹائی بچھا کر پڑ رہتا تھا اس شخص کی پرایویٹ لایف بالکل ایسی تھی جیسی کسی فقیر یا اہل اللہ کی ہوتی ہی۔ جو فرق کہ ایک عہدہ دار سرکاری کی پبلک او اور پرایویٹ لائف میں ہونا چاہیئے اُس نے اُس کو خوب سمجھا تھا اور وہ جانتا تھا کہ تنخواہ جو سرکاری خزانہ سے ملتی ہی وہ اپنی زندگی آرام وآسایش سے بسر کرنے کے لئے نہیں ہوتی بلکہ رفاہ خلایق کے لیئے ملایا کرتی ہی۔ کسب حلال کا ایسا شایق تھا کہ باوجود اتنی ثروت کے اُس نے اپنے پیشہ کو ترک نہیں کیا۔ خالی وقت مسجد و مدرسہ میں طالب علموں اور عالموں اور فقیروں کی صحبت میں گزارتا تھا اور شب جمعہ اور دوسری متبرک راتوں کو بھیس بدل کر اشرفیوں کی تھیلیاں لیکر تمام شہر میں گشت لگاتا تھا اور عاجزوں اور بے نوا لوگوں کو دے کر اُن سے کہتا تھا کہ یہ بادشاہ کا عطیہ ہی اُس کے قیام دولت کے لیئے دُعا کرو۔[1]

اولاد سے جو دُنیا میں بڑی دولت سمجھی جاتی ہی خدا نے اُس کو محروم نہ رکھا تھا اُس کے تین بیٹے تھے بڑے کا نام علی تھا جو اس قدر لایق ہوا کہ باپ کی زندگی ہی میں ملک التجار کا خطاب ملا اور ایک دفعہ راجہ بیجانگر کے

---

[1] تاریخ فرشتہ و ریاض الانشار۔

مقابلہ میں بھیجا گیا اُس کا منجھلا بیٹا عبد اللہ حسین شاہ گیلان کے یہاں ملازم تھا اور اُس کی سفارش میں خواجہ جہان اعیان گیلان کو اکثر خطوط لکھا کرتا تھا اور جب آخر میں وہ بدراہ ہوگیا تو اُس نے سلطان علاء الدین والی گیلان اور اُس کے وزراء کو اکثر خطوط اُس کو راہ راست پر لانے کے لئے لکھے اُس چھوٹے بیٹے کا نام الغخان تھا۔ اُس کے نام کے چند خطوط ریاض الانشاء میں موجود ہیں جن میں وہ اُس کو تعلیم و تربیت کا شوق دلاتا اور بدراہی سے متنبہ کرتا ہی اور کبھی کبھی بہت سختی سے اُس کو سرزنش و ملامت کرتا ہی۔ ان خطوط کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ اُس کو اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کا از حد خیال تھا۔ عزا واقربا سے بھی اُس کو بہت محبت تھی اور اپنے بھتیجوں سے اکثر خط و کتابت کیا کرتا اور اپنے بڑے بھائی شمس الدین محمد کا بہت ہی ادب کرتا تھا۔

تزک و احتشام جب یوسف عادل خاں سنہ ۱۴۸۲ء میں قلعہ انتور کی فتح کے بعد محمد آباد بیدر آیا تو سلطان محمد شاہ اس قدر خوش ہوا کہ خواجہ جہان کو حکم دیا کہ ایک ہفتہ تک اُس کی دعوت و مہمانی کرے اور کوئی تکلف اُٹھا نہ رکھے خواجہ جہان نے عرض کیا کہ یہ باتیں بغیر موجودگی بادشاہ کب نصیب ہوسکتی ہیں بادشاہ نے اُس کا مطلب سمجھ کر جواب دیا کہ پہلے یوسف عادل خاں کی

دعوت کرو اُس کے بعد ہمارا نمبر بھی آجائے گا۔ خواجہ جہاں نے ایک ہفتہ تک یوسف عادل خاں کو اپنے گھر مہمان رکھا اور اُس کی مدد سے اپنے گھر کو خوب سجایا۔ آٹھویں روز بادشاہ بھی باجاہ وجلال خواجہ جہاں کے یہاں آیا اور ایک ہفتہ مہمان رہا۔ چلتے وقت خواجہ جہاں نے اتنے تحفہ تحائف بادشاہ کی نذر گزرانے کہ سب لوگ حیرت میں رہ گئے۔ منجملہ ان تحفوں کے پچاس سونے کے طباق تھے جو اتنے بڑے تھے کہ سالم بکرے کا کباب اُن میں آجائے اور اُن کے سرپوش مرصع تھے۔ اور سو غلام چرکس و دکنی و حبشی تھے جن میں سے ہر غلام لکھنے پڑھنے اور گانے بجانے سے واقف تھا۔ اور سو گھوڑے ترکی و عربی و عراقی تھے اور سو چینی کی رکابیاں اور پیالے تھے جو ایسے خوبصورت اور عمدہ تھے کہ بادشاہوں کو بھی نصیب نہ ہوں یہ تحائف تو بادشاہ کو دیئے اُن کے علاوہ امرا کو بھی حسب حیثیت بیش قیمت ہدایہ دیئے اور اُس کے بعد نقد و جنس سے جو کچھ گھر میں تھا بادشاہ کے سامنے پیش کر کے کہا کہ "یہ جو کچھ ہے سب بادشاہ کا ہے سلطان کو اختیار ہے جسے چاہے بخش دے" سلطان محمد شاہ یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اُس نے ازراہ عنایت فرمایا کہ "میں نے قبول کر کے پھر اُسی شخص کو بخشدیا جو اُس کا

سب سے زیادہ مستحق[لہ] ہے۔"

غرور و انکسار

جب فتح کوکن کے بعد خواجہ جہان محمد آباد بیدر آیا اور بادشاہ اُس کے یہاں مہمان رہا اور اُس کے جاہ و منصب میں اس قدر ترقی ہوئی کہ آجتک کسی کو یہ درجہ نصیب نہ ہوا تھا اور ملکہ مخدومہ جہاں نے اُس کو بھائی کہا تو بادشاہ کے جانے کے بعد اس قدر مغموم ہوا کہ ایک کوٹھری میں بند ہوگیا اور کپڑوں کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور اس قدر رویا کہ بیہوش ہوکر زمین پر گرا جب ہوش میں آیا تو فقیرانہ لباس زیب بدن کیا اور محمد آباد بیدر علماء و فضلاؤ سادات کو جمع کرکے جو کچھ مال و متاع تاجری و امیری کے زمانہ میں جمع کیا تھا سب اُن میں تقسیم کردیا اور اپنے پاس سوائے کتابوں اور اسپ و فیل کے کچھ نہ رکھا۔ مُلا شمس الدین محمد جرجانی نے جو ایک مستند عالم اور خواجہ جہان کے مصاحبوں میں داخل تھے دریافت کیا کہ "یہ کیا بات ہے کہ آپ نے سب مال تو وقف کردیا مگر کتابوں اور ہاتھی گھوڑوں کو ہاتھ نہیں لگایا" خواجہ جہان نے جواب دیا کہ "جب سلطان محمد شاہ میرے گھر آیا اور ملکہ مخدومہ جہاں نے مجھے بھائی کہا تو شیطان نے میرے دل میں وسوسہ پیدا

[لہ] تاریخ فرشتہ۔

کیا کہ "ہیچو من دیگرے نیست" اُس وقت میں نے اپنے نفس پر لعنت کر کے بادشاہ سے بات کرنی موقوف کر دی بادشاہ نے دریافت کیا کہ یہ کیا کیفیت ہی میں نے عرض کیا کہ "دل میں درد ہی جس سے خفقان کو زور ہوا ہی" بادشاہ سمجھا کہ میں بیمار ہو گیا اس لیئے مجھے آرم کرنے کا حکم دے کر اپنے محل کو سدھارا۔ اسی لیئے میں نے تمام جاہ و حشم کو جو غرور کی جڑ ہی غارت کر دیا اور کتابوں کو اس وجہ سے رکھ لیا کہ یہ طالب علموں کے لیئے وقف ہیں میرا مال نہیں۔ اور ہاتھی گھوڑوں کا یہ حال ہی کہ وہ سلطان کا مال ہی۔ یہ بھی چند روزہ رعایت ہی کہ میرے پاس ہیں آخر سرکار ہی میں جائیں گے"[1]

علم | خواجہ جہان محمود گاوان ایک اچھا خاصہ عالم تھا اور علوم متداولہ میں اُسکی تحصیل پوری تھی خصوصاً ریاضی اور طب کا اُسے بہت شوق تھا۔ نظم و نثر پر بھی اچھی قدرت تھی مگر حساب میں تو ایسا ملکہ تھا کہ اُس زمانہ میں بہت ہی کم لوگوں کو ہوگا اور اُس کا خط بھی پاکیزہ تھا۔ اُس نے زمانہ کے رواج کے بموجب اپنے خطوط کو ایک رسالہ کی شکل میں جمع کیا تھا جس کا نام ریاض الانشاء[2] رکھا

---

[1] تاریخ فرشتہ۔

[2] یہ کتاب نواب صدیق یار جنگ بہادر مرحوم سابق ناظم دفتر ملکی کے کتب خانہ میں موجود ہی۔

اور ایک کتاب فن انشا میں لکھی جس کا نام مناظر الانشا[1] ہی اور ایک دیوان بھی غزلیات و قصائد کا لکھا[2] مگر معلوم نہیں کہ وہ دست برد زمانہ سے محفوظ ہی یا اُسی چاہ گمنامی میں غرق ہو گیا جو مسلمان مصنفوں کی تاک میں ہمیشہ لگا رہتا ہی لیکن اتنا تو معلوم ہی کہ ابوالقاسم فرشتہ کے زمانہ تک اُس کے نسخے دکن میں کہیں کہیں نظر آجاتے تھے۔ مشایخ کے ملنے کا تو اُسے ایسا شوق تھا کہ اپنے وسیع تجارتی سفروں میں جہاں کہیں اُس کا گزر ہوتا اُن کی صحبت سے ضرور فائدہ اُٹھاتا چنانچہ دکن کو بھی اُس کو شاہ محب اللہ کی زیارت کا شوق لایا تھا۔ عالموں کی صحبت میں بھی اُس کو بہت مزہ آتا تھا اور اُس کی فیاضی اُن کو اپنا حلقہ بگوش بنائے رہتی تھی ملا عبدالکریم ہمدانی جس نے اپنی شکرگزاری کو خواجہ جہان کی مفصل سوانح عمری لکھ کر ثابت کیا ہی[3] اُس کے معتقدان خاص سے تھا۔ مُلا شمس الدین اُس کا ندیم اور ملازم تھا۔ نامور شاعر سامعی اُس کے مصاحبوں میں داخل تھا اور مُلا نظیری پر بھی جو اُس زمانہ

---

[1] یہ کتاب مشہور ہی اکثر تلاش سے دستیاب ہو جاتی ہی۔

[2] اس کتاب کا ذکر ملا ابوالقاسم فرشتہ نے کیا ہی مگر اس زمانہ میں باوجود تلاش کے دستیاب نہیں ہوئی۔

[3] یہ کتاب بھی باوجود سخت تلاش کے دستیاب نہیں ہوئی ورنہ اُس سے بہت قیمتی مدد ملتی۔

[4] اس نظیری کو کہیں ملا نظیری نیشاپوری نہ سمجھا جائے جو بہت بعد میں گزرا ہی۔

کا مستند شاعر تھا خواجہ جہاں اس قدر مہربان تھا کہ اُس کو بادشاہ سے ملک الشعرا کا خطاب دلوایا اور اکثر علماے عراق و خراسان سے بھی اُس کی ملاقات تھی اور اُن کو ہمیشہ تحفہ و ہدایہ سے یاد کرتا رہتا تھا۔ اس زمانے کے سب سے مشہور شاعر ملا عبد الرحمن جامی کو خواجہ جہاں سے بہت خلوص تھا۔ انشا جامی[1] میں ایک خط نظم میں خواجہ جہاں کے نام کا موجود ہی جس کے ذریعہ سے مُلّا جامی نے اپنی ایک تصنیف (غالباً تحفۃ الاحرار) اُس کی نذر گزرانی تھی۔ اُنھوں نے ایک قصیدہ بھی خواجہ جہاں کے ایک خط کے جواب میں لکھا تھا جس میں اُس نے مولانا کو بیدر آنے کی دعوت دی تھی جس کا مطلع یہ ہی

مرحبا ای قاصد ملک معانی مرحبا الصلا کز جان و دل نزل تو کردم مرحبا

اور اصل مقصود کو اس طرح ادا کیا ہی

بعد تبلیغ سلام از بندہ جامی عرض کن گر مجالِ گفتگو باشد دراں حضرت ترا
کارزوے من ہمی دارد بسے کامل تراست ز آرزوئے عاشقِ مفلس بوصلِ کیمیا
تشنہ را در بادیہ روزی کہ باشد از سموم گرم چوں اخگر زمین و زندہ چوں آتش ہوا
میل دل دانی چساں باشد بسوئے آبِ زلال شوق من افزوں بود سوئے نوای بحرِ عطا
نیست در شہر شما از بہر منع زایراں شہر بیدر را چساں در بست بر رویم قضا

---

[1] انشاے جامی

از گراں جانی بنا رم سویت آمد ورنہ ہمت   جذب شوق از پیش روی دفع صد اداز قفا

اور ایک قطعہ میں فرماتے ہیں ؎

جامی اشعار دلاویز تو جنسے ہست لطیف   بود آں حسن ادا لطف معانی تارش
ہمرہ قافلۂ ہمت روان کن کہ رسد   شرف عز قبول ملک التجارش

خواجہ جہان کی فیاضی روپیہ ہی پر محدود نہ تھی بلکہ جس حیات بخش چشمہ سے خود سیراب تھا اُس سے دوسروں کا محروم رہنا بھی نہ دیکھ سکتا تھا۔ اُس نے شہر محمد آباد بیدر میں ایک نہایت عالی شان مدرسہ سنہ ۱۴۷۲ء میں تعمیر کیا۔ یہ عمارت نہایت مستحکم اور رفیع الشان ہی اس کا طول شرقاً

---

[1] گزشتہ تعلیم میں اور حال میں سفرنامہ روم و مصر و شام میں مسلمانان ہند پر یہ الزام لگایا گیا ہی کہ اُنھوں نے کسی اسلامی مدرسے کی بنیاد نہیں ڈالی حالانکہ یہ بالکل غلط ہی۔ مدرسہ محمودیہ بیدر تمام دنیائے اسلام میں مشہور ہی اور اس کے علاوہ تمام مسجدیں اور خانقاہیں مدرسہ ہی ہوتی تھیں اور قدیم اسناد کے ملاحظہ سے ظاہر ہوتا ہی کہ خانقاہوں اور مسجدوں کے متعلق خاص خاص معاشیں مدرسوں کے نام سے بھی ہوتی تھیں چنانچہ بعض مقبرہ تو ابھی تک مدرسہ ہی کہلاتے ہیں۔ جیسے دہلی میں ہمایوں کا مقبرہ آج تک مدرسہ کہلاتا ہی۔ اس کے علاوہ کوئی بڑی مسجد ایسی نہیں ہی جس میں طالب علموں کے رہنے کے لیئے متعدد حجرے نہ بنے ہوں اور بڑے بڑے شہروں میں عالی شان مکانات بھی خاص مدرسے کے نام سے موجود ہیں۔ چنانچہ دہلی میں بھی بعض ایسے قدیم مدرسے موجود ہیں۔ (مولف)

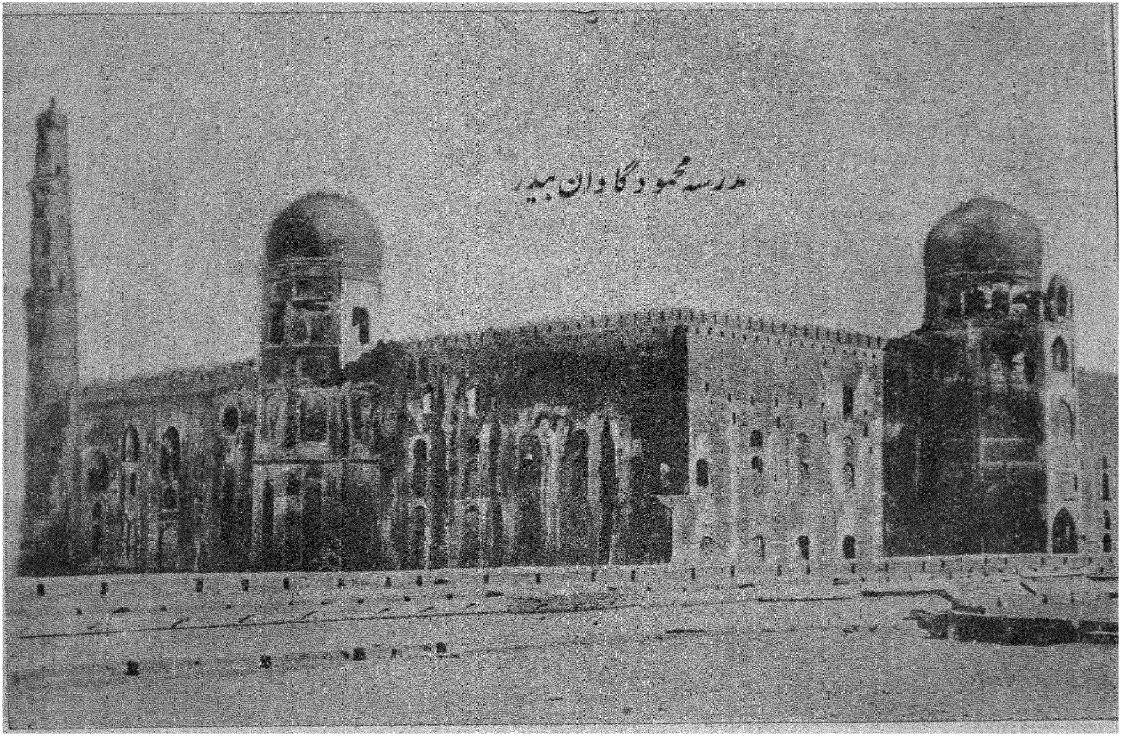

مدرسہ محمود گاوان بیدر

وغرباً (٦٧) اور عرض شمالاً و جنوباً (۵۵) گز ہی۔ مدرسے کے سامنے دو بلند مینار تھے جن میں سے ایک مینار اب بھی موجود ہی جو (١٠٠) فیٹ بلند ہی اور اُس پر سبز و زرد زمین میں سفید حرفوں میں کلام اللہ کی آیتیں لکھی ہوئی ہیں صحن میں مسجد تھی اور چہار طرف سے احاطہ سے ملے ہوئے علما و فضلا و طلاب کے رہنے کے لیئے کشادہ حجرے بنے ہوئے تھے اور جو طالب علم مدرسہ میں رہتے تھے اُن کو کھانا اور کپڑا وقف سے ملتا تھا۔ مساکین اور نو واردوں کو ہر روز لنگر بٹتا تھا۔ سر رچرڈ ٹمپل نے اس مدرسے کی نسبت لکھا ہی کہ ہندوستان کی قدیم عمارتوں میں جو اس وقت موجود ہیں یہ عمارت بہت ہی عمدہ اور بے مثل[؎] ہی یہ عمارت اس قدر مستحکم تھی کہ اُس پر گرم و سرد زمانہ کا اثر نہ پڑسکتا تھا لیکن اورنگ زیب کے زمانے میں اُس کے چند حجروں میں باروت کا میگزین بنایا گیا تھا کہ دفعتاً ١١ رمضان سنہ ١١٠٢ھ کو رات کے وقت بجلی گری اور مدرسے کا ایک حصہ اور اندرونی و بیرونی مکانات مع مسجد اور ایک مینار کے باروت میں آگ لگ جانے سے اُڑ گئے باقی مکان اور ایک مینار اب تک باقی ہی۔ مدرسے کے اندر دیوار شرق رویہ پر نقوش چینی ہیں

[؎] سر رچرڈ ٹمپل کا روزنامچہ حیدرآباد و کشمیر و سکم۔

خط جلی سے نیلے رنگ کی زمین پر سفید حرفوں میں کلام اللہ کی سورتیں لکھی ہوئی ہیں مدرسے کے متعلق ایک چوک بھی تھا جو ابھی تک موجود ہی گو کہ ویرانی کے عالم میں اپنے بانی کے زمانے کو یاد کر رہا ہی۔ مدرسے کی بنا ایسی نیک نیتی سے پڑی تھی کہ سرکار عالی کی قدامت پژوہی کی بدولت مڈل اسکول کے اس کے ایک حصّہ میں قایم ہونے سے خواجہ جہان کا فیض اب تک جاری ہی حسن قبول کی یہ دلیل کیا کم ہی کہ مدرسے کی تعمیر کی تاریخ بھی ایک ایسی آیت سے نکلی جو بانی کی نیک نیتی پر شہادت دے رہی ہی۔ سامی کہتا ہی

قطعۂ تاریخ

ایں مدرسہ رفیع و محمود بنا　　چوں کعبہ شدہ ہست قبلۂ اہل صفا
آثار قبول بیں کہ شد تاریخش　　از آیت رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا

مدرسے میں خواجہ جہان دوسروں ہی سے درس و تدریس کا کام نہ لیتا تھا بلکہ خود بھی پڑھایا کرتا تھا۔

مناظر الانشا یہ رسالہ خواجہ جہان محمود گاوان نے فن انشا میں لکھا ہی اور اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ اس زمانے میں علم انشا کا تصور کیا تھا۔ اسمیں

---

[1] صاحب مآثر برہانی نے اس تاریخ کو محمود بدر شیرازی سے منسوب کیا ہی

ایک مقدمہ۔ دو مقالے۔ اور ایک خاتمہ ہی۔ مقدمہ میں تو علم انشاء کی تعریف اور غایت اور اُس کے لوازمات بیان کیے ہیں۔ اور پہلے مقالے میں اہل انشا کے طریقے پر کلام کی تقسیم کی ہی اور یہ بتایا ہی کہ کن شرایط سے کلمات کا استعمال کرنا چاہیئے دوسرے مقالے میں اقسام وارکان و شرایط مکاتیب کو بیان کیا ہی اور خاتمہ میں خط کی ماہیت اور ضوابط کا بیان ہی۔

اس کتاب میں خواجہ جہان محمود گاوان نے اپنے اختراعات کو دخل نہیں دیا ہی بلکہ جو مستند کتابیں عربی زبان میں اس فن کے متعلق موجود تھیں اُن کا اقتباس کرکے فارسی ترکیبوں سے مطابق کیا ہی۔ انشاء کی یہ تعریف کی ہی کہ وہ ایک علم ہی جس سے خطب و رسائل کی تراکیب منثورہ کے معائب و محاسن اس حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں کہ وہ خطب و رسائل کی تراکیب منثورہ ہیں اور اُس کی غایت یہ ہی کہ تراکیب نثریہ کے معائب و محاسن کی پہچان ہو۔ اس تعریف اور اس غایت سے ظاہر ہی کہ اس علم کا تصور عملی طور پر زمانے کی اُلٹ پھیر سے کہاں سے کہاں پہونچا ہی۔

خواجہ جہان نے محاسن کلام کو نہایت تفصیل سے بیان کیا ہی اور بتایا ہی کہ فصاحت کسے کہتے ہیں اور اُس کے لوازمات کیا ہیں۔ صنایع و

بدایع کی حقیقت کیا ہی۔ کلمہ اور اُس کے بعد فقرہ کے فصیح ہونے کے لیئے کیا کیا چیزیں ضروری ہیں۔ اور ہر چیز کی مثالیں نثر میں زیادہ تر اپنے عربی فارسی کلام سے اور نظم میں شعرائے عرب و عجم کے نادر کلام سے دی ہیں۔ مثالوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ اُس کا دائرہ معلومات کس قدر وسیع تھا اور اُستادوں کے کلام کا اُس نے کیسی عمیق نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ عربی میں اُس نے اکثر مثالیں امرا القیس۔ متنبّی۔ ابو تمام۔ ابو نواس۔ ابن بابک۔ ابو البرکات ابن معتز۔ ابن سکرہ۔ ابن حجہ حموی۔ ابو الطیب۔ ابی الاسود۔ ابو العلا معرّی صفی الدین حلی۔ قاضی فاضل مصری۔ قاضی عضد الدین۔ ابن اصبغ مصری وغیرہ کے کلام سے دی ہیں۔ اور فارسی میں۔ اسدی۔ انوری۔ ظہیر فاریابی۔ سعدی حافظ سلمان ساوجی۔ کمال اسمٰعیل خلاق المعانی۔ شرف الدین یزدی۔ شاہی خوجو کرمانی۔ بابا سودائی۔ ابن حسام۔ جمال ترکی تبریزی۔ کاتبی۔ نظیری۔ امیر خسرو وغیرہ کے کلام کا حوالہ دیا ہی اور جو اشعار کہ درج کیئے ہیں وہ ایسے منتخب اور پر مضمون ہیں کہ جن سے اُس کے مذاق کی خوبی ثابت ہوتی ہی مثالوں کے علاوہ موقع و محل سے اُس نے بادشاہوں کی حکایتیں اور لطایف و ظرائف بھی درج کیئے ہیں۔ جن سے اُس کی تاریخی واقفیت معلوم ہوتی ہی۔

منشی کی یہ تعریف کی ہی کہ اُس کو کیفیت راسخہ ہو جس کے ذریعہ سے وہ ایسے طریقے سے جو بلغاء کے نزدیک پسندیدہ ہو اُس مطلب کو ظاہر کر سکے جس کا ظاہر کرنا مقصود ہو،، اور منشی ہونے کے لیۓ شرایط یہ ہیں کہ (۱) فکر رسا۔ حافظہ قوی اور طبیعت تیز ہو (۲) بلغاء کی تراکیب کی کثرت سے تتبع کی ہو۔ (۳) فاضلوں کے بلیغ اشعار کو نثر کیا ہو (۴) حافظ قرآن ہو یا اکثر آیتیں کلام اللہ کی یاد ہوں اور عمدہ عمدہ احادیث اور پرمضمون اشعار اور پرحکمت لطیفے اور ضرب المثلیں کثرت سے زبان پر ہوں (۵) الفاظ کو اُنھیں معنی میں استعمال کرنے کی قدرت رکھتا ہو جن میں بلغاء نے استعمال کیا ہی۔ (۶) جو غلطیاں کہ جہلا کی زبان و قلم سے شائع ہوں اُن سے احتراز کرے۔ (۷) ثقیل الفاظ و تراکیب کے استعمال سے بچے۔ (۸) جو الفاظ استعمال کرے اُن کو معنی مقصود کے ساتھ مناسبت تامّہ ہو اور آخر میں (۹) علم لغت عرب و صرف و نحو و معانی و بیان سے بخوبی واقفیت رکھتا ہو۔ غرضکہ منشی ہونے کے لیۓ نہ صرف اعلیٰ درجہ کے عالم ہونے کی ضرورت تھی بلکہ یہ بھی لازم تھا کہ انسان کے حافظہ اور ذہن کی اعلیٰ درجہ کی تربیت ہوئی ہو اُس کے بعد اُس نے خطوط کی تقسیم بلحاظ کاتب و مکتوب الیہ کے درجہ کے ہی اور بتایا ہی کہ ہر قسم

کے مکتوب کے کتنے ارکان ہوتے ہیں اور اس کے لیئے کتنی شرائط درکار ہیں غالباً اس بات کے معلوم ہونے سے معاصرین کو حیرت ہوگی کہ معمولی خطوط جو ہم روزمرہ لکھا کرتے ہیں اُن کے چودہ ارکان اور پندرہ شرائط ہیں۔ معمولی خط کے ارکان یہ ہیں (۱) لفظ جو پیشانی پر لکھا جائے (ہو اللہ یا ہو الکریم وغیرہ) (۲) ثناء (۳) دعاء (۴) اسم مکتوب الیہ (۵) ذکر کاتب (۶) سلام و تحیت (۷) ابلاغ سلام (۸) اشتیاق (۹) طلب ملاقات (۱۰) تاریخ۔ (۱۱) اعلام حال (۱۲) توقع والتماس (۱۳) مقدمہ اختتام (۱۴) اختتام بدعاء اور شرایط یہ ہیں (۱) مکتوب حرف "باء محدہ" سے شروع ہو یا لفظ "را" اسم مکتوب الیہ کے ساتھ لایا جائے۔ جیسے بحضرت یا فلاں را (۲) رکن ثانی میں پہلے چار فقرہ فارسی ہوں اور اُس کے بعد عربی (۳) القاب کاتب و مکتوب الیہ کے درجہ کے مناسب ہو (۴) اگر مکتوب الیہ سلطان اور کاتب وزیر یا امیر ہو تو مکتوب الیہ کا نام نہ لکھے (۵) مکتوب الیہ کے دشمنوں کو جو بددعا دی ہو اُس کے بعد مکتوب الیہ کا نام نہ لکھے (۶) اگر مکتوب الیہ بادشاہ اور کاتب وزیر ہو تو رکن ہفتم میں ابلاغ یا ارسال کے الفاظ نہ لکھے بلکہ اپنے مضمون کو بطریق تواضع دوسری طرح پہ ادا کرے (۷) اگر مکتوب الیہ اعلیٰ اور

کاتب ادنیٰ ہو تو رکن ہفتم و ششم کی بجائے اظہار خلوص و اعتقاد کرے۔
(۸) اگر زمان مفارقت طویل نہ ہو تو رکن اشتیاق نہ لکھے (۹) اگر بعد مکان
یا زمان درمیان نہ ہو تو رکن تاریخ کو حذف کردے (۱۰) اگر کاتب ادنیٰ
اور مکتوب الیہ اعلیٰ ہو تو رکن اعلام احوال اس طرح پر لکھے "بر خدام فلک
بارگاہ وغیرہ" (۱۱) اگر دعا ابتدا میں آگئی ہو تو آخر میں رکن دعا نہ لکھے۔
(۱۲) اگر مکتوب شریطہ سے مزین ہو تو جواب شریطہ میں لفظ "باد" کا استعمال
نہ کریں بلکہ ایک فقرہ لکھیں جس میں تین لفظ یا تین سے زیادہ لفظ ہوں یا
اسی قسم کے دو فقرے لکھیں (۱۳) اپنے اور مکتوب الیہ دونوں کی نسبت
ضمیر غائب استعمال کریں (۱۴) اگر کاتب و مکتوب الیہ مساوی ہوں تو
مکتوب الیہ کا ذکر لفظ جمع سے کریں (۱۵) اگر رکن ذکر کاتب محذوف کیا
جائے تو اعلام حال میں اس طرح نہ لکھیں کہ "مبلغ و مرسل میگرداند"، بلکہ یوں
لکھیں "مبلغ و مرسل داشتہ شد یا می شود"، اس زمانہ کے لوگوں کو جو اعلیٰ درجہ
کی انشا پردازی اس کو سمجھتے ہیں کہ اپنے جذبات دلی کو مختصر سے مختصر الفاظ
میں سیدھے سادے طور پر ادا کریں۔ اس تشریح سے خیال ہوگا کہ تصنع کی اعلیٰ
درجہ کی ترقی ہے کہ ایک معمولی خط بھی بلا اتنی قیود کی پابندی کے نہ لکھا جاسکے

لیکن یہ کوئی عیب نہیں ہے زمانہ کی خصوصیات ہیں۔ اگر کسی قوم کی انشا پردازی پر مورخانہ نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ جب کوئی قوم صحرائے وحشت سے نکلکر میدان ترقی میں قدم رکھتی ہے تو انسان کے جسم کی طرح جذبات بھی قوی ہوتے ہیں اور عالم ظہور میں آنے کے لیئے الفاظ کے محتاج نہیں ہوتے لیکن جب دوسری ترقی یافتہ قوموں سے میل جول اور عیش و عشرت اور تکلفات کی طرف میلان پیدا ہوتا اور ابتدائی اخوت کی بجائے درجہ بندی قایم ہو جاتی ہے تو لٹریچر میں بھی جو حقیقت میں قومی اخلاق و طرز معاشرت کی سچی تصویر ہوتا ہے وہی رنگ آجاتا ہے اور جذبات اور اُن کے سیدھے سادھے اظہار کو بے اثر سمجھ کر صنائع لفظی و معنوی کی طرف توجہ ہوتی ہے لیکن چونکہ طبیعت کی اصلی افتاد کے بدلنے کے لیئے بہت عرصہ درکار ہے اس لیئے پھر بھی اس زمانہ انقلاب میں لٹریچر میں ایک خاص بات باقی رہتی ہے لیکن جب اس سے بھی آگے بڑھ کر قومی اخلاق دولتمندی و عیش عشرت کے طوفان خیز موجوں سے ٹکرا کر پستی کی حالت کو پہونچتا اور قوم کی اصلی مستعدی و خودداری کو مفقود کر کے تقلید و غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیتا ہے تو وہی سماں لٹریچر میں بھی نظر آنے لگتا ہے۔ لوگ ایجاد پسندی کو عیب اور بجائے اپنی طبیعت پر زور دینے کے مسلم الثبوت استادوں کے کلام کی تتبع کو مایۂ افتخار

سمجھنے لگتے ہیں۔ ہمارے لٹریچر کی بھی یہی کیفیت ہی۔ ابتدا میں قومی معاشرت کی سادگی لٹریچر پر بھی محیط تھی لیکن جب شخصی سلطنت قایم ہوئی اور شخصی رعب داب و دولت مندی نے درجہ بندی کا سلسلہ ڈالا اور دوسری ترقی یافتہ قوموں سے میل جول ہوا اور ایرانی اور رومی تکلّفات جن کو ہماری قوت تخیلہ کی گلکاری نے اور بھی پررونق بنا دیا تھا ہماری طرز معاشرت کا جزو بن گئی۔ مٹّی کے جھونپڑوں اور چمڑے کے خیموں کی بجائے عالیشان محل ہر طرف نظر آنے لگے جن کی دیواروں پر بجائے سفید قلعی کے پچّی کاری اور میناکاری اپنی بہار دکھاتی تھی تو لٹریچر میں بھی وہی کیفیت پیدا ہو گئی جذبات سے قطع نظر اور توہم و تخیل کو زور ہوا اور بجائے معنی کے الفاظ کی پرستش ہونے لگی تقلب جس کو اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ کچھ خصوصیت سی ہو گئی ہی اس رنگ پر اور بھی روغن چڑھاتی اور پائدار کرتی رہی۔ مختصر یہ ہی کہ جو فرق بہ لحاظ طرز معاشرت کے خلفائے راشدین و خواجہ محمود گاوان کے زمانوں میں تھا وہ لٹریچر میں بھی نمودار تھا۔ اُس زمانہ کی سادگی کی بجائے اس زمانہ میں تصنّع اور خالص جذبات کے اظہار کی بجائے توہم و تخیل کی گل افشانیاں تھیں جنھوں نے مختلف آب و ہواؤں کے آغوش میں پرورش پائی تھی۔ اس زمانہ میں قدرتی حسن کا

جلوہ آنکھوں کو خیرہ کرنے کے لیے کافی سمجھا جاتا تھا لیکن اس زمانہ میں بال کی کھال نکالنا سونے پر جلا اور گلاب کی نازک پتیوں کو نقش و نگار سے آراستہ کرنا قومی مذاق کے مطابق تھا۔ الفاظ آلہ اظہار مطلب نہ تھے بلکہ ذریعۂ اخفا تھے قوت مدرکہ کو براہ راست مخاطب کرنا عیب اور نفس مطلب کو تخیل و توہم کے پیچدار راستہ سے جو بظاہر الفاظ کے ایک خوشنما و باترتیب سلسلہ میں مقید ہوتا تھا ذہن میں منتقل کرنا خوبی تھا۔ اس زمانہ میں سوائے طبیعت خداداد کے کوئی اُستاد نہ تھا اس زمانہ میں طبیعت داری اسی کا نام تھا کہ ماسبق لوگوں کے کلام کی ایسی تتبع کی جائے کہ پہچاننا دُشوار ہو۔

شاعری خواجہ جہاں کی تصنیفات سے صرف ایک کتاب ہی جو ہم کو نہیں مل سکی اور وہ اس کا دیوان ہی لیکن اُس کی انشاء اور تذکرۂ حدائق السلاطین سے اس قدر مواد بہم پہونچ گیا ہی کہ اُس کے کلام کی نسبت صحیح رائے قایم کی جاسکتی ہی۔ اُس نے فن شاعری میں بھی نثر کی طرح بہت محنت اور مسلم الثبوت اُستادوں کے کلام کی تتبع کی تھی چنانچہ ایک موقع پر اُس نے ریاض الانشاء میں تین قصیدے لکھے ہیں جن میں سے دو قصیدے فارسی میں ہیں جو کمال الدین اصفہانی اور حکیم الدین انوری کے طرز پر اور ایک بدیع الزماں ہمدانی کے طرز پر

عربی میں ہی جیسی کثرت و بے تکلّفی سے اُس نے عمدہ و منتخب اشعار جا بجا اپنے خطوط میں لکھے ہیں اُس سے معلوم ہوتا ہی کہ اُس نے اُستادوں کا کلام بہت کثرت سے پڑھا تھا اور صدہا بلکہ ہزارہا اشعار اُس کو یاد تھے یہ ظاہر ہی کہ اس کو بھی فن شعر میں اعلیٰ درجہ پر پہونچنے میں بہت دخل ہی اگرچہ زمانہ کی رفتار کے بموجب صنائع لفظی و معنوی اور الفاظ کی بندش و نشست و برخاست کی طرف اُس کو بہت توجہ تھی لیکن اُس کی طبیعت دراصل حقیقت پسند واقع ہوئی تھی اس لیئے محض شاعرانہ مبالغہ و تکلفات کو اُس کے کلام میں چنداں دخل نہیں ہی اکثر اوقات الفاظ کے نقاب کے نیچے سے دنیاوی تجربے اور پرحکمت نصیحتیں اور لطیف نکتے جھلک دکھا جاتے ہیں۔ تصوّف کا روغن بھی اُس کے کلام پر چڑھا ہوا تھا۔ قصائد میں وہی چست بندش وہی پرزور سیل آسا روانی وہی پرشکوہ الفاظ وہی بلند پرواز مبالغہ اور وہی تشبیہ و استعارہ کی کثرت و بے تکلفی موجود ہی جو اس قسم کے کلام کے لیئے مخصوص ہیں۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ خواجہ جہان قدرتی شاعر تھا اگر اُس کے کلام کو اصلی معیار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُس کو بالطبع شاعری کی طرف میلان نہ تھا بلکہ جو کچھ اُس نے لکھا ہی وہ اُستادوں کے کلام کی مزاولت و تتبع کا نتیجہ ہی

اُس کے کلام میں اُس وہبی قوت کا پتہ بھی نہیں ہی جو ایسے ایسے خیالات کا خوشنما مرقع انسان کی آنکھوں کے سامنے کھڑا کر دیتی ہی جو ہر شخص کو اپنی اصلی مگر پوشیدہ جذبات کا آئینہ معلوم ہوتا اور گزشتہ اور موجودہ کی قیود سے آزاد کر کے ایک دوسرے عالم میں پہونچا دیتا ہی۔ اگر شاعری کا مبدا و منتہی صنّاعی ہوتا تو بیشک وہ اعلیٰ درجہ کا شاعر سمجھا جا سکتا تھا لیکن چونکہ شاعری کا دارومدار وہ وہبی قوت ہی صنّاعی جس کی آئینہ بردار ہی اس لئے اُس کو اعلیٰ درجہ کے شاعروں میں جگہ نہیں مل سکتی۔ خواجہ جہان عربی میں بھی فارسی کی طرح بہت اچھے شعر کہتا تھا۔ مندرجہ ذیل اشعار سے اُس کا عام انداز کلام معلوم ہوگا۔

در وصل تو صد ہزار صاحب ہوس است   تا خود بوصال تو کرا دسترس است
آنکس کہ بیافت دولتی یافت عظیم   وانکس کہ نیافت درد نایافت بس است

شستم بہ آب چشمۂ اخلاص مہر دوست   از لوح جان و صفحۂ دل ہرچہ غیر اوست
ای بے نقاب دیدہ دل دیدہ روئے دوست   کافر دلست گر نظرش جز بسوئے اوست

از بس کہ اشک دشمنت جملہ جہان کرد تر   در زیر رانت خنگ چرخ افتان و خیزان میرود

گر نیستی عمارت این دل کہ شد خراب   انوار مہر بر دل ویران من بتاب

در جویبار عقل چو بخت شود بلند   از تند باد حادثہ کے میرسد گزند

ای دل از سیل فنا بنیاد هستی بر کند
چون ترا نوح است کشتیبان ز طوفان غم مخور
قصر قدر کان بدست قدرت حق شد بلند
کی رسد از تیشهٔ مکر کسان آزا گزند
در امید وصل او در حیات من صرف
ناوک شست شوق او دل شده طاق و جان هدف
چتر روان و تخت دل بی حجم عشق هیچ نیست
بی خط داغ عاشقی باد سواد تن تلف
جیب لباس عمر را تکمهٔ بوسهٔ کفش
بندم از آنکه آیدم دامن زندگی بکف
هر دعائیکه شد از بنده بحضرت مرجوع
مستجاب است یقین چون بود از فرط خضوع
کسی بغیر تو چون رخ کند که در همه حال
کسی بغیر تو باشد بنزد عقل محال
خالص چو گشت نقد روان ز آتش نهان
باشد بنام عشق تو تا لامکان روان
چون صبا در غنچه شکل و رنگ بوی آن دهان
یافت زد بوسه بکام و بوی خوش بگرفت زان
عشقست در ضمیر من و داغ بر دو رخ
پوشیده نیست از تو شعار و دثار من
کبوتر خانهٔ روحانیان را
نقاط و حرف کی دام است از آن
ز ظرف حرف افزون است ز طاق فلک بیرون
کنوز درد و غم کانیست الا در دل محزون
کسوت عشق تو در قامت دل میدیدم
چون بپوشید به بالاش نه کم بود نه بیش
علم است چون حیات ابد ای پسر بکوش
وز چشمهٔ حیات خود آب حیات نوش
گر نظر بر من کنی دورم ز تو بی شبهتی
لیک مهر با ذرات دارد الفتی

ز مہرت گشت چون یاقوت اشکم مفگنش در خاک
کہ از جنس جواہر بود یاقوت شہلائی
ہمہ عالم نگران تا نظرِ بخت بلند
ہر کہ افتد کہ تو یکدم نگرانش باشی

قطعہ

چون حیاض خاطرم ہست از سحاب فیض پر
از زلال طبع ہر کس حاجت فوارہ نیست
جوہر عین الہرت کر مرا در درج دہر
جز رگان خاطرم از طبع کس نارہ نیست

قطعہ

فضل و علم نقص و عیب آید شد ہندوستان چہ باک
زانکہ اینجا بود و باشد فضل فضلہ علم عار
از بیاض لوح ہستی محو باد تا ابد
صورتِ ماہیت زشت سواد این دیار

رباعی

چو بشنوی سخن فن اگر بفعل آری
کلید گنج سعادت در آستین آری
دگر تو دُرِ نصیحت بدُرج دل ننہی
بنے خوری ز کف و ہر سلی خواری

قصیده

شد شکل ضرب تیغت بر دوش من حمائل
هیکل ز حرز سیفی وانگه هراس ایدل
از پرتوِ جمالت دیوانه مهر تابان
از رشتهٔ شفاعت سر تا بپا سلاسل
جانز است پا در گل تا دید دیده جان
در طوف گلشن دل آن شکل و آن شمائل
بر شمعدان دل زان شمع روان نهادم
تا دیدن رخت را بنود جهات حائل
دل با چراغ عشقت محراب قبلهٔ جان
تن بے خیال رویت جانز است چاه بابل
تیغ تو آب حیوان مردم ز حسرتِ آن
آرے به بخت من شد آب حیات قاتل
جان در لحاف تن بود رفته بخواب غفلت
آمد ندا که برخیز یا ایها المزمّل
بفگن کمند مدحت بر قصر قدر شاهی
کافلاک با کواکب بر قصر داشت کهگل
سلطان محمد آن شه کز فرط کبریایش
در موقف غلامان صد سنجر است و طغرل

قصیدهٔ دیگر

اے مهر بے زوال توام طالع ازل
یا مهر اینچنین عنم از ظلمت اجل
کے لایق عروض زوال است مهر عشق
ما فی الازل چگونه بود غیر لم یزل

بصورتیکه عقل تصوّر کند ز حُسن
باشد به نزد معنی حسن تو مبتذل

ریاض الانشاء خواجہ جہان کی دوسری تصنیف کا نام ریاض الانشاء[1] ہی جس میں اُس نے اپنے خطوط کو جمع کیا ہی خواجہ جہان کو فن انشاء میں جیسا کہ مناظر الانشاء کے ملاحظہ سے ظاہر ہی کامل دستگاہ اور وہ اس فن کے نکات سے پوری طرح واقف تھا جو باتیں کہ خود اُس کے قول کے بموجب ایک منشی کے لیئے ضرور ہیں وہ سب اُس میں موجود تھیں۔ اُس کی طبیعت تیز اور فکر رسا اور حافظہ آیات قرآنی احادیث نبوی۔ برجستہ اشعار اور پُرحکمت ضرب الامثال کا مخزن تھا۔ اُستادوں کے کلام کی تتبع اُس نے بہت کثرت سے کی تھی چنانچہ مناظر الانشا میں خود ایک موقع پر لکھا ہی کہ اُس نے انوری و کمال اسمٰعیل و سلمان کے اشعار کو عنفوان شباب میں نثر کیا تھا۔ مسلم الثبوت اُستادوں کے کلام کا اُس نے ایسی عمیق نظر سے مطالعہ کیا تھا کہ ایک ایک لفظ کے استعمال کی خوبی سے واقف تھا اور علم لغت میں اُس کو ایسی دستگاہ تھی کہ جب وہ قلم اُٹھاتا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ آب زلال کا ایک دریا ہی کہ زور سے موجیں مارتا ہوا بہا چلا جاتا ہی۔ علم صرف و نحو و معانی

---

[1] اس کا نام تاریخ فرشتہ میں غلطی سے روضۃ الانشا رکھا گیا ہی۔

وبیان سے اُس کا واقف ہونا توضروریات سے تھا کیونکہ وہ فارسی کی طرح عربی میں بھی اعلیٰ درجہ کا ناظم وناثر تھا۔ مناظر الانشا میں اُس نے فصاحت کی یہ تعریف کی ہی کہ ”فصاحت کلام کے ضعف تالیف[۵۱] وتنافر کلمات[۵۲] وتعقید[۵۳] لفظی ومعنوی سے پاک ہونے کا نام ہی“ اور بلاغت کی یہ تعریف کی ہی کہ ”کلام کے حسب مقتضائے فصاحت سے مطابق ہونے کا نام بلاغت ہی“ پس اگر اس معیار سے خواجہ جہان کی انشا پردازی کا اندازہ کیا جائے (اور یہ ظاہر ہی کہ کسی دوسرے معیار سے ہم کو اُس کے کلام کا اندازہ کرنے کا حق نہیں ہی تو معلوم ہوگا کہ اُس کے ہر لفظ اور ہر جملہ پر فصاحت وبلاغت کی تعریف پوری طرح پر صادق آتی ہی۔ اُس کا اندازِ بیان بالکل اپنے زمانہ کی طرز کے مطابق ہی۔ اس میں بھی وہی پرشکوہ الفاظ کی خوش آئند روانی آیات قرآنی واحادیث نبوی وضرب الامثال عربی کی دلچسپ رنگ آمیزی۔ اشعار برجستہ کا برمحل استعمال۔ صنائع لفظی ومعنوی کی کثرت لطافت کے ساتھ شاعرانہ تخیل کی دلفریب گل افشانیاں۔ حفظ مراتب کا

---

[۵۱] ضعف تالیف۔ کلام کا قواعد نحویہ کے مطابق نہ ہونا۔

[۵۲] تنافر کلمات۔ کلمات کا زبان پر ثقیل ہونا۔

[۵۳] تعقید۔ ترتیب الفاظ کا ترتیب معنی کے مطابق نہ ہونا۔

اعلیٰ درجہ کا خیال۔ اور اظہار مطلب کو ان سب اُمور کے تابع رکھنا پایا جاتا ہی گویا کہ اُس کے کلام کی نسبت کہا جا سکتا ہی کہ دست صنعت نے سبزۂ خوابیدہ کا ایک ہموار تختہ تیار کیا ہی جس پر کہیں تو سفید سنگریزوں کی گلکاری ہی اور کہیں سرخ کی اور کسی مقام پر گل لالہ اپنی بہار دکھا رہا ہی اور کہیں نرگس کے پھول چشم با انتظار ہیں اور کسی جگہ شفاف سیمیں چشمے سریلی آواز سے بہہ رہے ہیں اور کہیں بلوری حوض میں شفاف فوارے ساون کی جھڑی کی طرح چھوٹ رہے ہیں۔ مولانا عبدالرحمن جامی نے شاعرانہ انداز سے ایک موقع پر اُس کی انشاپردازی کی تعریف کی ہی مگر اُس کا ماحصل بھی دراصل وہی ہی جو ہماری رائے کا ہی۔ مولانا جامی لکھتے ہیں ؎

نظم و نثرش ہیں کہ پنداری پیر چرخ کرد
عقد پرویں را در اثنائے بنات النعش جا
یا خود افتاد است مخزونات گنج پر گہر
بر بساط عرض بعضے متصل بعضے جدا
فقرہائے نثر او قوت دہ پشت ہنر
نکتہائے نظم او روشن گرِ شمعِ ذکا

جو شخص کہ ایسے طرز بیان کا پابند ہو اُس کے کلام میں مشکل ہی سے اُس کے اصلی جذبات کا پتہ لگ سکتا ہی لیکن ریاض الانشا کے مطالعہ سے خواجہ جہان کی نیک نفسی علم کے شوق علماء و صلحا کی صحبت کے ذوق خاندانی عظمت و جلال

بادشاہ کے تقرب میدان جنگ کے کارناموں حوصلہ کی بلند پروازی اعزا کی محبّت اولاد کی تربیت سب باتوں کی کیفیت معلوم ہوتی ہی اگر اس زمانہ کے لحاظ سے اُس کے طرز بیان کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُس کے کلام میں سب سے بڑا نقص یہ ہی کہ تھوڑے مضمون کو بہت سے الفاظ میں ادا کرتا ہی اور وہ بھی اس طرح پر کہ تشبیہ و استعارہ و اقتباس کی کثرت و نزاکت کی وجہ سے مضمون کے سمجھنے میں دقّت ہو خطوط کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ اُس کا دائرۂ اتحاد بہت وسیع تھا اور سلاطین و امرا و علما و مشائخین سب طبقوں پر حاوی تھا سلاطین میں سلطان ابوسعید گورکان سلطان مراد رومی سلطان حسین بیگ سے اور امرا و وزرا میں وزیر صدرالدین کبیر المخاطب بہ شرف الملک۔ صدرالدین شرف جہان۔ امیر جان شاہ اللاری۔ وزیر محمود شاہ رومی اور اُس زمانہ کے اکثر دوسرے سلاطین کے وزرا سے اور علما میں شرف الدین علی یزدی۔ شمس الدین محمد اللاری۔ مولانا ابوسعید۔ قاضی صدر جہان۔ مولانا عبدالرحمن جامی۔ مولانا ابوبکر الطہرانی۔ شیخ محمود المندوی وغیرہ سے اور مشایخین میں خواجہ سید عبیداللہ۔ مولانا نعمت اللہ۔ شیخ صدرالدین الرواسی وغیرہ سے اور اپنے رشتہ داروں میں اپنے چچا اور دو بھتیجوں عمدۃ الملک اور خواجہ برہان الدین اور اپنے تینوں بیٹوں علی

عبداللہ حسین اور الف خاں سے خط و کتابت تھی۔ جو خطوط کہ اُس نے اپنے بھتیجوں کو لکھے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہی کہ وہ اُن سے کس قدر مالوف تھا اور اُس کو اپنی اولاد کی تربیت کا ایسا خیال کہ اُس نے جتنے خطوط کہ سلاطین گیلان کو لکھے اُن سب میں اپنے منجھلے بیٹے عبداللہ حسین کی سفارش کی ہی اور التجا کی ہی کہ اُس کو بُری راہوں سے بچایا جائے اور اپنے چھوٹے بیٹے الف خاں کو تو جو خط اُس نے لکھا ہی اُس میں اُس کی بُری عادتوں پر ملامت کی ہی اور حصول علم کی ترغیب دلائی ہی اور اسی طرح بڑے بیٹے علی کو بھی بہت سی بیش بہا نصیحتیں کی ہیں لیکن اُس کی سب سے مزہ دار خط و کتابت مولنا عبدالرحمٰن جامی کے ساتھ تھی جن سے اُس کو دلی اُنس تھا اُن کو کبھی ہندوستان آنے کی دعوت دیتا ہی کبھی کوئی قیمتی تحفہ بھیجتا ہی کبھی طلب فیض اور کبھی اظہار خلوص کرتا ہی ذیل میں ایک اُس کا خط علی ملک التجار کے نام کا درج کیا جاتا ہی جس سے نہ صرف اُس کا طرز تحریر معلوم ہو گا بلکہ یہ بھی ظاہر ہو گا کہ اُس کے نزدیک حکومت میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے کونسی باتیں ضرور ہیں۔

نسخہ مکتوبی کہ بفرزند بزرگ خود علی مخاطب بملک التجار نوشت

اللہم کما جعلتہ خلف الاشراف اجعلہ شرف الاخلاف و آیۃً من محاسن الاوصاف

اکثر حمایت والده و الاسلاف. چون آتش جان سوز عشق در کانون دل اشتعال یافت و زبانه آن از روزنه دهان بر سطح مخروطی لسان تافت. از تراکم دخانش سودای سواد نامه در دماغ ناطقه و سویدای دل خامه افتاد و لیکن فی الحقیقت.

؎ زبان ناطقه در شرح شوق ما لال است
چه جای کلک بریده زبان بیهوده گوست

لاجرم بعلت این سودای خام که در سرشت روان مخمر است میخواهد که بر مقتضی مصرع کما یتداوی شارب الخمر بالخمر. درد غم و اندوه هجر را بسواد کلمات شوق آمیز نظم و نثر کرامت شفا ارزانی شود اما هیهات هیهات که صورت صهبای صبابت جان بامتزاج زلال و سلسال مقال سمت فتور و نقصان یابد ؎

گفتم که سوز آتش دل کم شود باشک
آن سوز کم نگشت و زبانم بتر بسوخت

بلکه خوف آنست که مبانی امانی بقا از تکاثر سیلان بکاء و توافر تأوّه و اشتکا موصوف بصفت دکاً دکاً گردد و فیاض قدیر جلّ عن الشبیه و النظیر که بمشعل ماه و نور عالم افروز مهر که منوّر طاق مسدس سپهر است شب دیجور دل مهجور را بروز وصل و حضور مبدل گرداند و ظلمت دیده خاطر محزون را بنور تلاقی و حضور متحوّل ؎

دارم امید بدین اشک چو باران که دگر
برق شادی که برفت از نظرم باز آید

معلوم آن فرزند باد که جان مشتاق با تأمل محبت و اشفاق در دل میزد که صور تفاصیل احوال اینجائی بر صفحهٔ صحیفهٔ مقال باز نماید لیکن پیر عقل که استاد کارخانهٔ ابداع است دست منع و ارتداع بر سینهٔ جان اتباع نهاد که صرف عنان قلم از صوب تفصیل بجانب اجمال محض مقتضی حال است میباید که آن فرزند غبار ملال از رخسار بال زائل گرداند که بعنایت الله المتعال صورت هر مراد که قلم نقشبند خیال بر ورق بال میکشد در آئینهٔ حصول باحسن وجه منظور است بعد هذا مخفی نماند که چون همت شفقت و محبت آن فرزند بر گریبان دل این مستمند محکم بود واجب دید که انجمن خیال او را بنور شمع نصیحت خلاق روشن گرداند می باید که آن قرة العین علو دعایم سروری و سمو قوائم مهتری در رعایت لوازم امارت و احاطت شرایط و ارکان وزارت داند تا در نظر اهل فضائل بحکم مستحق انفاذ سیف و اجرای قلم باشد بعضی از شرائط و ارکان و محاسن و لوازم آن بوسیله ترجمان قلم تیز زبان از درج ضمیر در سلک بیان می آرد و بواقی آن بتعقل و ادراک آن فرزند محول میدارد و یقین داند که خلاف خیال موجب ذبول نهال آمال است و مستلزم اختلال مبانی جلال و

نعوذ بالله من عروض هذا الحال یکے آنکه در استجماع محاسن خصائل و استرفاع رایت مکارم شمائل بنوعی اهتمام نماید که چنانچه ظل جامعیت عوالم بر فرق فرزندهای انسان ممدود است کما احاطه صفات حمیده بر میان جان آن فرزند فی التحقیق مسدود باشد کما قول ؎

لو زرته لرایت النّاس فی رجل ⁂ والدهر فی ساعة والارض فی دار

تا تمام افراد امم در نشر محامد شیم آن فرزند متفق الهمم و متحد الکلم باشد

شعر

فافا لنّاس کلهم لسان واحدٌ
یتلو الثناء علیك وَالدُّنیا فم

دیگر آنکه در مبادی بوادی طلب مآرب از ملاحظه کیفیات عواقب غافل و ذاهل نباشد و در کسب مواد جمیع مرام و مراد بر نمط سلوک والد و اجداد جمل و تفاصیل وقائع استقبال از صفحه جریده حال مشاهده کند تا کسان بادی و حاضر در مجالس و محاضر محمدت و ثنای آن فرزند ذاکر باشند ؎

یری عاقبات الرای ذالرای مقبل | کان له فی الیوم عینًا علی غد
هو التابع التالی اباه کما تلا | ابوه اباه سیّدا و ابن سیّد

دیگر آنکه بر مقتضی انزل النّاس منازلهم هر یک از امراء و صغار و کبار و صفدران

مصاف کارزار را بقدر حال معزّز و مستمال دارد و زنگ ملال از آئینۂ بالشان بمصقل اعزاز و اجلال بزداید ؎

اذا تلمت منک العرفا لمال هیّن
وکل الذی فوق التراب تراب

ودیگر آنکه صورت عفو و سیاست بقلم موی فراست و کیاست در مواضع و محال خویش بوجه جمیل بنماید ؎

اذا انت اکرمت الکریم ملکته
وان انت اکرمت اللئیم تمردا

وضع الندی فی موضع السیف بالعلی   مضر کوضع السیف فی موضع الندی

ودیگر آنکه کسانیکه به بدائع درایات و صنائع کفایات مُتحلّی باشند و دیده مردم بزرگ منش از فور دانش و بینش ایشان ممتلی و فور سداد و صواب از چهرۂ خطاب و جواب شان توان دید و سر فتنه و دست شر به تیغ حدس ذهن و دقّت نظر تواند برید ؎

فؤاد لانواع الفضائل جامع   ورای لاعقاب الامور بصیر
؎ دلش برنده نقش فتن بدست حکم   کفش زننده حد ستم بنوک قلم

ایشان را بصنوف مواهب و ضروب ترقیات مراتب محظوظ دارد و وجوه مآرب و مطالب ایشان را بعین قبول و حصول ملحوظ و اگر عارض مطیر مرحمت آن ارجمند بنهال وجود پنجتن کسانرا برشحات تربیت سبز و شاداب نگرداند رخسار کمال شعار و دثارش در کرمگاه نصاف حسن اوصاف مجروح به نبال عیب و عار خواهد بود فنعوذ بالله من عروض هذا الرسم علی وجنة الاسم۔

و دیگر آنکه مردمی که دوش ایشان از کسوت کسب فضائل و ردائے حسن شمائل عاری باشد و کواکب مناقب از افق وجود شان متواری بیقین داند که ایشان را در فتح مغالق معضلات امور هیچ ذریت نیست و بمصاحبت و مجالست بزرگان هیچ نسبت نه و اگر نعوذ بالله بمساعدت و معاونت بعضی از اشخاص بساط صحبت آن فرزند بنقش قربت ایشان مرقوم گردد رخسار جمال حالش بطعن لسان اکابر زمان موسوم خواهد بود ؎

اصحب اخا کرم تحظی بصحبته   فالطبع مکتسب من کل مصحوب
فالرّیح آخذة مما تمر به   نتنًا من النتن و طیبًا من الطیب

و دیگر آنکه بیمن ایالت و دولت ریاض ناصر ملک و ملّت را از صرصر ظلم اهل فساد و تطاول مردم شرارت نهاد مصئون گرداند و بوسیلهٔ ایمنی عمود سعادت را

فراز قبهٔ گردون داند چه برذمم همم حکام رفع خار ستم از پای دل تمام امم عین فرض است و دست تغلب ظلمه عساکر از جیب عرض و بال اصاغر و اکابر نگاهداشتن موجب نجات یوم العرض کما قال عمر بن الخطاب رضی الله عنه" ما فیکم عندی اقوی من الضعیف حتی اخذ به ولا اضعف من القوی حتی اخذ الحق" ؎

فاعدل تکن من صروف الدهر ممتنعاً
فالصرف ممتنع للعدل فی عمر

و دیگر آنکه مواجب و رواتب روسائے حشم و اطلاق ارزاق توابع فیل و خدم بے منت و اهمال و تکسل و امهال بر وجه اتم برساند و این معنی را اهم داند و امرائے لشکر و خواد عسکر را کثرت مشاق و تکلیف ما لا یطاق تنفر نگرداند ع

بشکسته شود کمان چو از حد بکشی

و بنور کرم و بذل تمام درون دل خواص و عوام را منور دارد و شرط اصابت کرم و رکن افاضت نعم آن است که فیضان بذلش مانند غمام بر مطیع و عاصی و ادنی و اقاصی عام باشد و چهرهٔ افضال و انعام متوسم بسمت بشر و ابتسام و با وجود ظلام الحاج و ابراح انام التماغ مهر تواضع و اکرام کالشمس فی اوقات الظواهر باهر و ظاهر و دامن مکرمتش از عرض خبث و اذی و منت مطلقاً طاهر ؎

اذا ابو حامد جادت بنا مده   لم یجد الا جود ان البحر والمط
وان اضاء بنا بشر بعزته   تضاءل النیرات الشمس والقمر

دیگر آنکه تقدیم تدبیر کار و تربیت مقدمات تامل و افتکار بر ذمت همت خود لازم گرداند و چون تیر فکر در کمان تدبیر موضوع سازد سر نیاز و خشوع بر خاک عجز و خضوع استوار دارد تا در آئینه تدبیر آن فرزند جمال صورت تقدیر بنماید که دولت عبارت از توافق تدبیر با تقدیر است و بعد از توفیق تدبیر بمشاورت مردم پیر و جوان روشن ضمیر پائے همت بال در رکاب عزیمت قتال و جدال آورده ؎

الرای قبل شجاعة الشجعان   هو اول وهی المحل الثانی
واذا هما اجتمعا لنفس حرة   بلغت من العلیاء کل مکان

و چون از سر رائے و فرهنگ قدم در میان جنگ نهد متوکلاً علی الله النصیر خزانه خیال از وسوسه تعلق حیات و تخیل و تصور لذات و مشتهیات خالی دارد و در صدر طاق دل جز صورت ناموس و نام ننگارد و عمامه جرأت و جسارت را بر هامه همت خود محض سعادت و عین کرامت داند ؎

بزم مردان عرصهٔ رزم است و عشرت دار و گیر
باده خون دشمن و جام دمادم تیغ و تیر

در مقام قرار و ثبات بکلمات مردم ضعیف نبات خیانت سمات ہیچ التفات نماید ؎

تری الجبناء ان الجبن حزم
وتلک خدیعة الطبع اللئیم

وشک نیست کہ نقش ممات بر جبہہ ذات بہ از گلگونہ بیدلی بر چہرہ حیات است ونزول قبر بجراحت حسام وسنان بہ از عروج معارج حیات مع اقتران طعن لسان اقران شعر

ونحن اناس لا توسط بیننا لنا الصدر دون العالمین او القبر
یہون علینا فی المعالی نفوسنا ومن خطب الحسناء لم یغلہ المہر

زیادت بریں امواج حروف تراکم در لجۂ بحر معانی متلاطم نساخت و شمع موعظت خورشید اشراق بر لگن الفاظ در انجمن اشفاق نسوخت ہموارہ تیر گزارش از کمان ضمیر بر عین غرض و اصل باد ولشکر ظفر اثرش در وسط بیجانگر نازل ہمین من یحق الحق ویبطل الباطل فقط

فن زراعت خواجہ جہاں کی علمی قوت صرف انشاء پردازی پر ہی ختم نہ ہوئی تھی بلکہ وہ عملی طور پر ایسے ایسے میدانوں میں بھی جو انسان کے امن و آسایش و عیش و آرام کے لیے مفید ہیں بار آور ہوئی تھی۔ خواجہ جہاں منجملہ دوسرے فنون کے

فن باغبانی سے اچھی واقفیت رکھتا تھا۔ اُس نے موجودہ میووں کو ترقی دی اور اعلیٰ درجہ کے امرود اور کئی قسم کے انگور لگائے اور بعض نئی چیزوں کی کاشت بھی شروع کی ہندوستان میں یہ ایک مشہور بات ہے کہ زعفران کی کاشت کے لیے خطۂ کشمیر مخصوص ہے لیکن خواجہ جہان نے بیدر کی زرخیز زمین میں صلاحیت دیکھ کر زعفران کی کاشت کی۔ اس زمانہ میں بیدر میں نام کو بھی زعفران نہیں ہوتی لیکن اگر سرکار عالی توجہ کرے تو کیا عجب ہے کہ اس قیمتی چیز کی کاشت سے پھر ملک و رعایا کو فائدہ پہونچنے لگے[1]۔

ہمعصروں کی قدردانی

خواجہ جہان کی جیسی قدر کہ دربار بہمنیہ میں تھی اُس کے اعادہ کی کچھ ضرورت نہیں ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ سلاطین عراق و خراسان بھی اُس پر غائبانہ نظر التفات رکھتے تھے۔ سلطان حسین مرزا بادشاہ ہرات کا شوق تو یہاں تک بڑھا کہ اُس نے مولانا سید کاظم کو جو اُس زمانہ کے مشاہیر سے تھا قندھار و لاہور کی راہ سے اُس کی طلبی میں سفیر کرکے بھیجا مگر محمد شاہ خواجہ جہان جیسے شخص کو کہاں چھوڑتا تھا آخرکار محمود گاوان کو سید کاظم کو مایوس واپس کرنا پڑا مگر اُس کے ہاتھ بادشاہ ہرات کے لیے بہت سے قیمتی تحفے بھیجے لیکن سید

---

[1] تاریخ فرشتہ۔

کاظم راہ ہی میں تبریز پہونچکر فوت ہو گیا اس لیئے اُن تحائف کا بھی اُسی کے ساتھ قصہ تمام ہوا۔

انکسار

ایک مرتبہ محمد آباد بیدر کے قلعہ ارک کے قصر میں خواجہ جہان محمود گاوان سلطان محمد شاہ کی مجلس میں بیٹھا تھا کہ اتنے میں گائے ڈکرانے لگی۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے محمود گاوان سے شوخی سے دریافت کیا کہ ”ای آصف جاہ یہ گائے کیا کہتی ہی“ خواجہ جہان نے جواب دیا کہ ”یہ کہتی ہی تو تو ہم میں سے ہی سلطان کی مجلس میں کیا کرتا ہی“ محمد شاہ یہ سُن کر بہت ہنسا اور کہنے لگا کہ مجھ کو اپنے ماسبق شاہان بہمنیہ پر یہ ترجیح ہی کہ میرے دربار میں خواجہ جہان جیسا نوکر ہی جو کبھی کسی کو نصیب نہیں ہوا۔

خواجہ جہان کی شہادت

خواجہ جہان محمود گاوان کو اپنے انجام کی خبر ایک عجیب طرح سے ہوئی تھی۔ جب اُس کو خواجہ جہان کا خطاب ملا ہی تو وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ ”سلطان علاء الدین بن احمد شاہ بہمنی کے زمانہ میں سب سے پہلے یہ خطاب خواجہ مظفر علی استرآبادی کو ملا تھا جس کو چند ہی روز بعد شاہزادہ محمد خان نے قتل کیا اُس کے بعد خواجہ جہان ترک کا نمبر آیا جس کا انجام بھی ظاہر ہی پس معلوم نہیں کہ میرا کیا حال ہوگا۔ حیرت کی بات ہی کہ اُس کا یہ خیال

نے بنیاد ثابت نہیں ہوا۔ یہ تو معلوم ہو ہی چکا ہی کہ خواجہ جہان کو ایک عرصہ سے امور سلطنت میں جز و کل کا اختیار حاصل تھا اور گو وہ بادشاہ نہ تھا مگر عملی طور پر کوئی کام اُس کے بلا مشورہ اور خلاف رائے نہ ہوتا تھا۔ ایشیائی درباروں میں اگرچہ یہ مرتبہ قابل رشک ہی لیکن اُسی کے ساتھ پرخطر بھی بہت ہی۔ جو لوگ کہ ظاہری نظر سے دیکھنے والے ہیں وہ تو یہ سمجھتے ہیں کہ اُس شخص سے بہتر کس شخص کی حالت ہو گی جس کے ہاتھ میں حکومت ہی دولت ہی ثروت ہی جو خیال دل میں آتا ہی پیدا ہوتے ہی پورا ہو جاتا ہی بادشاہ اُس کے اشاروں پر چلتا ہی خلقت اُس کی حلقہ بگوش ہی۔ لیکن اگر اُس شخص کے دل کو چیر کر دیکھو تو معلوم ہو گا کہ وہ اکثر اُس زمانہ کو حسرت کے ساتھ یاد کیا کرتا ہی جبکہ وہ چاہ گمنامی میں غرق تھا اور اگر کوئی نظر اُس پر اتفاق سے پڑ جاتی تھی تو وہ رشک و حسد سے مُعرّا ہوتی تھی اور اُس کی خوشی اور بہبودی خود اُسی کی کوشش پر منحصر تھی نہ کہ کسی کی متلوّن نظر کے التفات پر۔ اگر ایسا شخص تمام اقتدارات کا مرجع ہوتا ہی تو اُسی کے ساتھ زہریلی نگاہوں اور بد باطن سازشوں کا ہدف بھی ہوتا ہی اور سیکڑوں کوششیں جن کا رخ پہچاننا اور نوعیت کا سمجھنا دشوار ہو اُس کی مخالف ہوتی ہیں خواجہ جہان محمود گاوان کو

جب یہ قابلِ رشک مرتبہ حاصل تھا تو اُس کے ساتھ یہ تمام اندیشہ ناک خطرے بھی درپیش تھے لیکن اُس کی مشکلیں یہیں ختم نہ ہوئی تھیں۔ دکن اُس کا وطن نہ تھا۔ اس لیئے وہ کثیر گروہ جو دکن کو اپنا وطن سمجھتا تھا اُس کو ظاہر میں خوف مگر باطن میں حقارت کی نظر سے دیکھتا اور دل ہی دل میں سمجھتا تھا کہ وہ اُن کے حقوق کا غاصب اور خود مختاری کو خاک میں ملانے والا ہی۔ اگر حقیقی نظر سے دیکھا جائے تو محمود گاوان نے اپنے طرزِ عمل سے پوری طرح پر ثابت کر دیا تھا کہ وہ ملک کا دلی خیر خواہ اور اہل ملک کا سچا ہمدرد ہی لیکن ایسی حق پرست نظریں مُلک میں کتنی ہوتی ہیں اور جو ہوتی ہیں کیا اُن کو ناقص جذبات جس میں ہوسِ دُنیا اور حسد کا خمیر ہوتا ہی خیرہ نہیں کر دیتے۔ حسد وہ بلائے بے درماں وہ غولِ بیابانی ہی کہ جس آنکھ سے اُس کی زہر آلود آنکھیں مقابل ہوتی ہیں اُس کو ہمیشہ کے لیئے اندھا کر دیتی ہیں اور جس کان میں اُس کی حق شناس آواز اپنا اثر کر جاتی ہی پھر اُس میں کسی دوسری آواز کے جانے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ اس سب پر یہ مستزاد تھا کہ خواجہ جہان نہ صرف آفاقی اور بادشاہ کا معتمد خاص تھا بلکہ رفارمر بھی تھا۔ بدقسمتی سے اُس کی رائے میں خواہ صحیح ہو یا غلط ملک کی حالت محتاج اصلاح تھی اور اصلاح بھی ایسی

جس سے ذی اقتدار لوگوں کا اقتدار گھٹے حوصلہ مندوں کے حوصلہ پست ہوں اور شورہ پشتی کا دروازہ ہمیشہ کے لیئے بند ہو جائے اور یہ اور غضب ہوا کہ بادشاہ اُس کی سُنتا تھا اور اس وجہ سے جو کچھ اُس کا خیال تھا پورا بھی ہو گیا اس آخری گھونٹ کے مقابلہ میں تو پہلے سب گھونٹ گو وہ بھی تلخی میں کم نہ تھے آب کوثر کا حکم رکھتے تھے۔ یہ ایسا زخم تھا کہ جس کے اندمال کی کوئی صورت ہی نظر آتی تھی۔ قاعدہ ہی کہ ایک روش پر چلنے کی عادی طبیعتیں کچھ ایسے خود فراموشی کے عالم میں غرق ہو جاتی ہیں کہ اپنی طرف سے تو کبھی اصلاح کے خیال کو دل میں آنے ہی نہیں دیتیں اور اگر کوئی دوسرا شخص ایسا خیال دلاتا ہی تو اُس کی ضرورت کو تسلیم نہیں کرتیں لیکن جب اُس کا کچھ اثر نہیں ہوتا اور وہ خیال مقبولیت کے درجہ کو پہونچ جاتا ہی تو اُس کا مضحکہ اُڑاتی ہیں اور جب یہ وار بھی خالی جاتا ہی اور وہ خیال تخیل کے درجہ سے آگے بڑھ کر عملی قالب میں جلوہ گر ہوتا ہی تو خلایق کو اُس کے مفروضہ قبیح نتائج سے ڈراتی ہیں جب یہ کوشش بھی کارگر نہیں ہوتی تو تمام غصہ و مایوسی کا وبال اُس بدقسمت شخص کے سر پر ٹوٹ پڑتا ہی جس سے بظاہر وہ اصلاح منسوب ہوتی ہی اگرچہ سبھی اصلاحوں کو یہ مدارج طی کرنی پڑتے ہیں

لیکن جن سے کسی حاصل شدہ حق پر اثر پڑتا ہی اُن کی تو بڑی ہی مشکل ہی۔ پالیٹکس کا یہ ایک مسلمہ اصول ہی کہ کسی حاصل شدہ حق میں دست اندازی کر کے کامیابی کی اُمید رکھنا سادہ لوحی پر دلالت کرتا ہی اور اس وجہ سے دور اندیش مدبر جب اس خطرناک میدان میں قدم رکھتے ہیں تو آہستہ آہستہ ایسی چال سے چلتے ہیں کہ کسی کو محسوس نہ ہو۔

خواجہ جہان محمود گاوان نے جو اصلاحیں کیں اُن کا میلان یہ ضرور تھا کہ بادشاہی حکومت قوی اور امرا کے ہاتھ کمزور ہوں بہت سے لوگ تو اُس سے اس وجہ سے ناراض ہوئے کہ اُن کے اختیارات کا خاتمہ ہو گیا اور بہت سے لوگ جو انقلاب سے فائدہ اُٹھانے کی اُمید میں بیٹھے ہوئے تھے وہ اپنی آرزوؤں میں مایوس ہو کر اُس کے دشمن بن گئے۔ لیکن جو شخص کہ ان اصلاحوں سے سب سے زیادہ ناراض ہوا وہ اُس کا قدیمی دست گرفتہ ملک حسن نظام الملک بحری تھا۔ خواجہ جہان کی اصلاحوں سے پیشتر نظام الملک صوبہ تلنگانہ کا طرفدار تھا لیکن جب خواجہ جہان نے تلنگانہ کو دو صوبوں میں تقسیم کیا تو راجمندری کا سرحدی صوبہ نظام الملک کے تفویض ہوا اور ورنگل کا طرفدار اعظم خاں بنایا گیا۔ نظام الملک کو یہ نہایت ہی شاق گزرا اور اُس کا

غصہ اس سے اور بھی بڑھ گیا کہ خواجہ جہان نے جو قوت کے منتشر رکھنے
کے فواید سے بخوبی واقف تھا اُس کے بیٹے ملک احمد کو ہوشیار و حوصلہ مند پاکر
باپ سے علیحدہ کر دیا اور سہ صدی منصب دیکر صوبہ ماہور میں خداوند خاں
حبشی کے تحت میں جاگیر دی۔ نظام الملک بھی ایک تربیت یافتہ درباری
تھا اُس نے یہ حالت دیکھ کر محمد شاہ سے عرض کیا کہ خانہ زاد حضور اقدس اعلیٰ
کے قدوم میمنت لزوم سے جدا ہونا نہیں چاہتا سرحدی مہموں کے سر کرنے
کے لیئے بندہ زادہ کافی ہو غلام اپنی طرف سے اُس کو راجمندری کی سرلشکری
پر مقرر کر دے گا" بادشاہ نے بھی اس بات کو معقول سمجھ کر پسند کیا اور خواجہ
جہان کو بھی سوائے تعمیل کے چارہ نہ ہوا۔ رنجش کی ابتدا تو یہی تھی لیکن امتداد
زمانہ کے ساتھ وہ بھی بڑھتی گئی۔ نظام الملک جو ایشیائی درباروں کا پرورش یافتہ
تھا پولیٹکل سازشوں کے پوشیدہ راز اُس سے پنہاں نہ تھے اُس نے ظریف الملک
دکنی اور مفتاح حبشی سے جو بادشاہ کے مقرب تھے اتحاد پیدا کیا اور اُنھوں نے
ایک رائے ہو کر غلامان شاہی کو جن پر بادشاہ کا خاص التفات تھا ملایا اور
اُن کو سمجھا دیا کہ وہ کبھی موقع پیدا کر کے خواجہ جہان کی شکایت کرتے رہیں
جب تک کہ خواجہ جہان اور یوسف عادل خان جس کو اُس نے متبنے کیا تھا

بادشاہ کے قریب رہے اُس وقت تک تو کسی سازش نے اثر نہ کیا لیکن جب یوسف عادل خاں کو بادشاہ نے مہم بیجانگر پر بھیجدیا اُس وقت سازشیوں کی خوب بن پڑی۔ ان لوگوں نے یہ چال کی کہ خواجہ جہان کے ایک غلام سے جس کے پاس اُس کی مُہر رہتی تھی دوستی پیدا کی اور زر و جواہر اور قسم قسم کے عمدہ عمدہ گھوڑے دیکر اُس کو اپنا شرمندۂ احسان بنایا۔ ایک روز ظریف الملک اور مفتاح حبشی نے مجلس شراب گرم کی اور اثنا صحبت میں ایک کاغذ نکالکر کہنے لگے کہ یہ ہمارے فلاں دوست کی برات ہے اکثر عہدہ داران دیوانی کی مہریں اُس پر ثبت ہیں اگر خواجہ جہان کی بھی مہر لگ جاتی تو کیا اچھا ہوتا غلام تو پہلے ہی سے مدہوش تھا اُس نے بلا اس کے کہ پورا کاغذ کھول کر دیکھے یا پڑھے جس مقام پر ظریف الملک نے بتایا بے تکلف مہر لگادی اور کمبخت یہ نہ سمجھا کہ یہ برات نہیں ہے بلکہ اُس آقا کا پروانۂ اجل ہے جو اُس کو اولاد سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ ظریف الملک اور مفتاح حبشی نے جب دیکھا کہ چال چل گئی تو دوڑے ہوئے ملک حسن نظام الملک بحری کے پاس گئے اور اُس کے مشورہ سے اُس کاغذ سادہ کو خواجہ جہان کی طرف سے مندرجہ ذیل مضمون برائے اُڑیسہ[1]

---

[1] مآثر برہانی میں راجہ بیجانگر درج ہے۔ مگر یہ خلاف قیاس ہے اس لیئے کہ راجہ بیجانگر کے مقابلہ میں اُس زمانہ میں خود یوسف عادل خاں موجود تھا حالانکہ خط میں یہ درج ہے کہ سرحد پر کوئی ہوشیار افسر موجود نہیں ہے۔

کے نام لکھ کر روانہ کیا۔

" محمد شاہ کی شراب خواری اور ظلم نے ہم سب کو اُس سے بددل کر دیا ہے اور آپ کی ادنیٰ توجہ میں دکن کی فتح ممکن ہے کیونکہ سرحد پر کوئی ہوشیار افسر موجود نہیں ہے جس وقت آپ نے خوف وخطر اپنے لشکر کے ساتھ مملکت دکن میں داخل ہو جائیں گے تو چونکہ اکثر امرا میرے کہنے سے باہر نہیں ہیں میں بھی ہر طرف سے مخالفت کھڑی کر دونگا اور بادشاہ کو نکال باہر کر دینے کے بعد مملکت دکن کو آپس میں برابر تقسیم کر لیں گے۔"

جب یہ کارستانی ہو چکی تو ظریف الملک اور مفتاح حبشی ایسے وقت حاضر دربار ہوئے کہ جس وقت ملک حسن نظام الملک بحری باریاب تھا اور اُنھوں نے موقع پاکر اُس پرفریب مراسلہ کو بادشاہ کی نظر سے گزرانا سلطان محمد شاہ خواجہ کی مُہر پہچانتا تھا وہ اُس کو دیکھ کر بہت ہی پریشان ہوا اور ملک حسن نظام الملک بحری نے فرصت کو غنیمت سمجھ کر ایسی ایسی موحش باتیں کہیں کہ جن سے بادشاہ کی آتش غضب اور بھی مشتعل ہوئی اور اُس کی نظر التفات کا وہ باریک ڈورا جو خواجہ جہان کا رشتۂ حیات تھا منقطع ہو گیا۔ اُس وقت کوئی ایسا شخص بھی موجود نہ تھا جو بادشاہ

کے غصہ کو ٹھنڈا کرتا۔ خواجہ جہان کی قدیم قدردان ملکہ مخدومہ جہاں پہلے ہی سنہ ۱۴۷۲ء میں فوت ہو چکی تھی اور اُس عالی شان مقبرہ میں بے خبر سو رہی تھی جو ابھی تک موجود ہی[1] یوسف عادل خاں اور دوسرے اُمرار آفاقی جو خواجہ جہان کے دوست اور بادشاہ رس تھے مہم بیجانگر پر تھے۔ غرضکہ بادشاہ نے برہم ہو کر بلا سوچے سمجھے اور بغیر کسی قسم کی تحقیقات کیئے خواجہ جہان کو طلب کیا خواجہ جہان کے رفیق بھی بے خبر نہ تھے اُنھوں نے خواجہ پر حقیقت حال ظاہر کر کے مشورہ دیا کہ آپ آج تو خدا کے لیئے نہ جائیں جس طرح سے ہو سکے ٹال دیں لیکن خواجہ جہان اپنی بے گناہی کے نشہ میں ایسا چور تھا کہ اُس نے کسی کی بات بھی نہ سُنی اور یہ شعر جو اُس زمانہ میں اکثر اُس کے ورد زبان رہتا تھا پڑھا ؎

چوں شہید عشق در دنیا و عقبےٰ سرخروست
خوشدمی باشد کہ مارا کشتہ زین میدان برند

اور جوش میں آکر کہنے لگا کہ "یہ بال جو محمد شاہ کے باپ ہمایوں شاہ کی

---

[1] یہ مقبرہ بشکل گنبد بہیئت مربع ہی جس کا ہر ضلع پندرہ گز اور ارتفاع پچیس گز ہی۔ تاریخ بیدر مصنفہ اسد اللہ شاہ صاحب میں درج ہی کہ اُس کی تیاری میں قریباً ۲ لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا۔ اخبار الاخیار

خدمت گذاری میں سفید ہوئے ہیں اگر محمد شاہ کی بدولت خون کے خضاب سے رنگین ہوں تو موجب سرخروئی ہی۔ میرے کیئے سے کیا ہوتا ہی جو قسمت میں لکھا ہی وہ ہر حال میں پیش آئے گا"

چند بڑے بڑے امرا نے جو خواجہ جہان کے رفیق تھے کہلا بھیجا کہ حالت دگرگوں ہی ہزار سوار موجود ہیں اگر آنجناب گجرات کا قصد فرمائیں تو ہمراہ رکاب چلنے کو ہم بھی حاضر ہیں مگر خواجہ جہان کو یہ کب باور آسکتا تھا کہ بادشاہ دم بھر میں اُس کی تمام عمر کی خدمات و وفاداری کو بھول جائے گا اور اگر باور آیا تو اُس نے اب آخری وقت میں جان چھپا کر بھاگنے کو اپنی شان کے خلاف سمجھا اس لیئے اُس نے اُن کو جواب میں کہلا بھیجا کہ "مجھ کو اس کار ابدپا مدار کی خدمت میں برسوں گزر گئے اور اُس کے زیر سایہ ایک عمر سے بعیش و عشرت زندگی بسر کر رہا ہوں کبھی مجھ سے کوئی خطا ظہور میں نہیں آئی یہ کب ممکن ہی کہ بادشاہ فقط میرے دشمنوں کی تہمت باندھنے پر بلا تحقیقات و دریافت میری دغا بازی کا یقین کرے اور بالفرض اگر اُس نے ایسا کیا بھی تو اُس کے غصّہ کو برداشت کرنا اس آخری وقت میں نمکحرامی کرنے پر ہزار درجہ ترجیح رکھتا ہی۔ یہ کہکر اُسی وقت سلطان محمد شاہ کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ محمد شاہ نے دیکھتے ہی

دریافت کیا کہ اگر کوئی شخص اپنے آقا کے ساتھ نمکحرامی کرے اور یہ امر پایۂ ثبوت کو پہونچ جائے تو اُس کی کیا سزا ہو۔ خواجہ جہان نے نہایت اطمینان سے جواب دیا کہ "اگر پایۂ ثبوت کو پہونچ جائے تو ایسے بدبخت کی سزا سوائے شمشیر آبدار کے کیا ہوگی"۔ یہ سُنکر بادشاہ نے خواجہ جہان کو وہ خط دکھایا۔ خواجہ جہان نے دیکھکر آیت "سبحانک ھذا بہتان عظیم" پڑھکر کہا کہ "میری مہر تو بیشک ہی مگر خط میرا نہیں ہی" اور اپنی بیگناہی پر حلف اُٹھایا۔ مگر بادشاہ تو پہلے ہی سے شراب سے بدمست اور غصہ میں بھرا بیٹھا تھا اُس کے دل پر ایسی باتوں کا کیا اثر ہوتا تھا آخرکار اُس نے اپنے غلام جوہر نامی کو خواجہ جہان کے قتل کا حکم دیا اور خود اُٹھکر محل سرا کی طرف چلا۔ خواجہ جہان سے اب تو نہ رہا گیا اُس نے سلطان سے مخاطب ہوکر کہا کہ "میں تو عمر طبعی کو پہونچ چکا ہوں اگر آج قتل نہ ہوا تو کل اپنی موت مرجاؤنگا مگر میرا قتل ملک کی خرابی اور حضور کی بدنامی کا موجب ہوگا"۔ محمد شاہ نے اس کا کچھ جواب نہ دیا اور سیدھا محل میں گھُسا ہوا چلا گیا۔ خواجہ جہان کے دل پر بادشاہ کی احسان فراموش خاموشی کا خواہ کچھ ہی اثر ہوا ہو لیکن اُس کے جاتے ہی دوزانو روبقبلہ بیٹھکر کلمۂ لا اِلٰہ اِلّا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ پڑھا جوہر غلام تو اشارہ ہی کا منتظر تھا اُس نے ادھر تو

بادشاہ گیا اُدھر غلاف سے تلوار نکال کر بلند کی اور جب اُس کے خون کی پیاسی چمک خواجہ جہان کو محسوس ہوئی تو "الحمد للہ علی نعمۃ الشہادۃ" زبان سے بے اختیار نکلا اور ابھی یہ کلمہ ختم نہوا تھا کہ وار اپنا کام کر گیا اور وہ سر جس کو مدت سے بادشاہ پر نثار ہونے کی تمنا تھی گردن سے جدا ہو کر زمین پر گرا۔ یہ ایسی خوش گوار موت تھی جس کی ہر مسلمان کو تمنا ہوتی ہی اور خواجہ جہان کے لیئے تو اس لیئے اور بھی دلپسند تھی کہ اُس نے پیری و صد عیب کا ایک منٹ میں فیصلہ کر دیا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

یہ واقعۂ جانکاہ کند پوری میں پنجم ماہ صفر ۸۸۶ھ مطابق ۱۴ اپریل ۱۴۸۱ء کو ہوا اور اُس وقت اُس کی عمر ۷۰ سال کی تھی یہ عجیب بات ہی کہ خواجہ جہان نے مرنے سے دس برس پہلے محمد شاہ کی مدح میں ایک قصیدہ کہا تھا جس کے دو اشعار یہ ہیں ؎

شد شکل ضرب تیغت بر دوش جاں حمائل ہیکل ز حرز سیفی وانگہ ہراس ابدل
تیغ تو آب حیواں مردم ز حسرت آں آرے بعہد من شد آب حیات قاتل

مُلّا عبدالکریم ہمدانی نے اُس کی شہادت کی نسبت دو قطعہ تاریخ کہے جو ذیل میں درج ہیں:-

قطعہ

شہید بےگنہ مخدوم مطلق
کہ عالم را ز جودش بود رونق
وگر خواہی تو تاریخ وفاتش
فرو خواں قصۂ قتل بناحق

۸۸۶ ہجری

قطعۂ ثانی

سال فوتش گر کسے پرسد بگوی
بیگنہ محمود گاوان شد شہید

۸۸۶ ھ

اور سامی نے جو اُس کا ندیم اور ملازم تھا یہ تاریخ کہی

قطعہ

چوں خواجہ جہاں را ہرگز حرامخواری
در دل نبود میکرد پیوستہ جانسپاری
گشت او شہید مغفور اے سامی بتحقیق
تاریخ کشتن او جواز حلال خواری

۸۸۶ ھ

محمد شاہ کا غصہ محمود گاوان کی شہادت ہی پر ٹھنڈا نہیں ہوا۔ بلکہ تمام لشکر میں منادی کر دی کہ جو شخص چاہے سوائے ہاتھی گھوڑوں اور اسباب خاصہ کے خواجہ جہان کے مال لوٹے۔ یہ سُن کر جو امیر خواجہ جہان کے تابع تھے وہ فوجیں جما کر کھڑے ہو گئے مگر اتنے ہی میں خبر پہونچی کہ بادشاہ اُن کے بھی قتل کی فکر میں ہی۔ اس لیئے وہ سب فوراً منتشر ہو گئے اور اُن میں سے اکثر یوسف عادل خاں کے پاس چلے گئے اور لشکری اور بازاریوں نے جو خواجہ جہان کی زندگی میں اُس کے سامنے سر جھکاتے اور اُس کی فیاضی سے پرورش پاتے تھے۔ موقع پا کر دم بھر میں اُس کے تمام مال و اسباب کو خاک میں ملا دیا۔ معلوم ہوتا ہی کہ خواجہ جہان کو رعایا میں بھی ہر دلعزیزی کا درجہ حاصل تھا کہ محمد شاہ نے خواجہ کے قتل کے بعد ایک طول طویل فرمان جاری کیا جس میں بہت تفصیل سے اُس کے قتل کے وجوہ لکھے تاکہ رعایا بادشاہ پر الزام نہ لگائے[1]۔ جب بادشاہ نے خواجہ جہان کے نوکروں کو بُلا کر روپیہ کی طمع میں خواجہ جہان کا اندوختہ بتانے کے لیئے اُن پر ہر قسم کی سختی کی تو معلوم ہوا کہ اس خزانہ میں صرف تین سو لاری[2] موجود ہیں اور سوائے ساڑھے تین ہزار کتابوں کے

---

[1] مآثر برہانی [2] لاری ایک قدیم چاندی کا سکہ ہی جو ۵۰ ر کے برابر ہوتا ہی۔

جو طالب علموں کے لیے وقف ہیں کچھ نہیں ہی اور یہ کہ خواجہ جہان اپنی زندگی اس طرح بسر کرتا تھا جس طرح کہ اہل اللہ کرتے ہیں یہ سُن کر بادشاہ کی آنکھیں کھلیں اور اُس کو معلوم ہوا کہ اُس کے حق شناس ہاتوں نے ایسی جان لی ہی جو صدہا جان سے زیادہ خود اُس کے حق میں مفید تھی مگر اب کیا ہوتا تھا۔ وہ قیمتی جان جو ایک دفعہ کالبد خاکی سے جُدا ہو چکی تھی واپس نہ آسکتی تھی لیکن بادشاہ نے پھر بھی اتنا کیا کہ خواجہ جہان کا تابوت باعزاز و اکرام محمد آباد بیدر کو روانہ کیا اور تیسرے روز تمام امرا و ارکان دولت کو بہمراہی شاہزادہ محمود خاں خواجہ جہان کی زیارت میں بھیجا۔ خواجہ جہان محمود گاوان ایک پختہ تالاب کے پاس جو اُس نے رفاہ خلائق کی غرض سے بنوایا تھا دفن ہوا اور ایک عالیشان مقبرہ جو اُس کے متوسلین و معتقدین نے تعمیر کیا تھا آج تک موجود ہی۔ جوہر غلام کی خونخوار تلوار کا وار خواجہ جہان کی گردن پر نہ پڑا تھا بلکہ سلطنت بہمنیہ کے استحکام کی جڑ پر لگا تھا یہ خواجہ جہان ہی کے مضبوط قدم تھے جو فتنہ و فساد اور مخالف دلوں کی شرانگیز گردن کو ایسا دبائے ہوئے تھے کہ ہل نہ سکتی تھی اور جب وہ بیجان ہو کر قبر کی جی بٹھا دینے والی تاریکی میں غائب ہوگئے تو ہر طرف شورش برپا ہوگئی۔ کسی بڑے شخص کا ذی اقتدار ہونا جس قدر

ملک کے حق میں مفید ہے اُسی قدر مضر بھی ہے۔ ایشیائی حکومتوں میں جہاں شخصی رائے و تدبیر سب کچھ ہے زبردست حکومت اور طوائف الملوکی میں صرف دو چار ہی قدم کا فاصلہ ہوتا ہے۔ جب تک ایک زبردست ہاتھ موجود رہتا ہے اُس وقت تک سب مخالف اجزا ایک ذات معلوم ہوتے ہیں لیکن اگر بادشاہ خود ہیچ اور ناقدر شناس ہوا۔ اور اُس بڑے شخص نے اپنا سچا جانشین نہ چھوڑا اور چھوڑنا اُس کے اختیار میں بھی نہیں ہوتا تو تمام جزا پریشان اور قدیم مخالفتیں زور و شور کے ساتھ نمودار ہو جاتی ہیں جو انجام خلافت بنی اُمیہ کا اندلس میں حاجب المنصور کے مرنے کے بعد ہوا وہی کیفیت دکن میں بھی خواجہ جہان کی شہادت کے بعد سلطنت بہمنیہ کی ہوئی۔

خواجہ جہان کی آنکھ بند ہوتے ہی ذی اقتدار الوالعزم لوگوں کے خودغرض حوصلے مخالفت کی شکل میں نمودار ہوئے اور چونکہ سب کے سامنے محمود گاوان کی عمر بھر کی وفاداری و خدمت گزاری کا صلہ موجود تھا اِس لیئے ہر شخص نے خیر خواہی سلطنت سے قطع نظر کرکے اپنی بہبودی کو مقدم سمجھا چنانچہ سات ہی برس کے عرصہ میں سلطنت بہمنیہ کا ڈیڑھ سو برس کی زبردست حکومت کے بعد خاتمہ ہوا اور ققنس کی طرح اُس کی خاک سے

پانچ آزاد خود مختار حکومتیں اُٹھ کھڑی ہوئیں لیکن سلطنت بہمنیہ کے خاتمہ کے ساتھ ہی اس مختصر کتاب کا بھی خاتمہ ہی۔ فقط

المعلم

یہ جنوبی ہند کا واحد تعلیمی ماہوار رسالہ ہی جو زیر سرپرستی سررشتہ تعلیمات سرکار نظام و بادارت سجّاد مرزا صاحب ایم اے (کنٹب) اور محمد عظمت اللہ خاں صاحب بی اے حیدر آباد دکن سے شایع ہو رہا ہی۔ مضامین سب کے سب سلیس عبارت میں اعلیٰ پایہ کے ہوتے ہیں۔ اس کی اور ایک خصوصیت جو اپنا نظیر نہیں رکھتی یہ ہی کہ پورا رسالہ ہاتھ کے بنے ہوئے دولت آبادی کاغذ پر طبع ہوتا ہی سالانہ قیمت معہ محصول ڈاک عے ہو۔ نمونہ کے پرچہ کے لیئے ۵ر کے ٹکٹ ارسال کرنا ضروری ہی۔

منیجر رسالہ المعلم۔ بلگرامی ہوس
حیدر آباد دکن

باتصویر

بچوں کا قاعدہ

مرتبہ سجّاد مرزا۔ ایم۔ اے (کنٹب) صدر مہتمم تعلیمات صوبہ گلبرگہ

اس وقت تک اردو زبان میں ایک بھی ایسا قاعدہ مرتب نہیں ہوا ہے جو جدید ترین اصول تعلیم کے مطابق ہو۔ مروجہ قاعدوں کی ترتیب میں نہ کوئی اصول ہے نہ بچّہ کی دلچسپی کا سامان اور نہ اس کی سہولت کا لحاظ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ حروف ابجد کے نام یاد کرنے۔ مہمل مرکبات اور بے معنی ہجے رٹنے میں عمر کا بیش قیمت حصّہ ضایع ہو جاتا ہے اور دماغ ایسا موثر ہو جاتا ہے کہ پھر پڑھنے لکھنے سے طبیعت بھاگنے لگتی ہے۔ بچّوں کا قاعدہ ان تمام نقائص کو مدنظر رکھ کر ترتیب دیا گیا ہے۔ مرتب کا دعویٰ ہے۔ کہ اگر اس قاعدہ کو ہدایات مندرجہ قاعدہ کے مطابق پڑھایا جائے تو معمولی سمجھ کا بچہ اب جتنا وقت صرف کرتا ہے اس کی چوتھائی مدت میں پڑھنے لکھنے لگے گا۔ ہندوستان کے سربرآوردہ اشخاص اور مشہور و معروف اخبارات نے اس کی خوبیوں کو تسلیم کر لیا ہے۔

طرز جدید کا یہ پہلا باتصویر قاعدہ۔ بقیمت ۸ر فی جلد فروخت ہوتا ہے تاجروں اور مدارس کو تجارتی نرخ پر مل سکتا ہے۔ علاقہ سرکار نظام کے لیئے حضور نظام اور علاقہ انگریزی کے لیئے کنگ جارج پنجم کی تصویر لگائی گئی ہے۔

ملنے کا پتہ (۱) دی حیدرآباد بک ڈپو چادرگھاٹ حیدرآباد دکن

(۲) نظامی پریس بدایوں۔ یو۔ پی